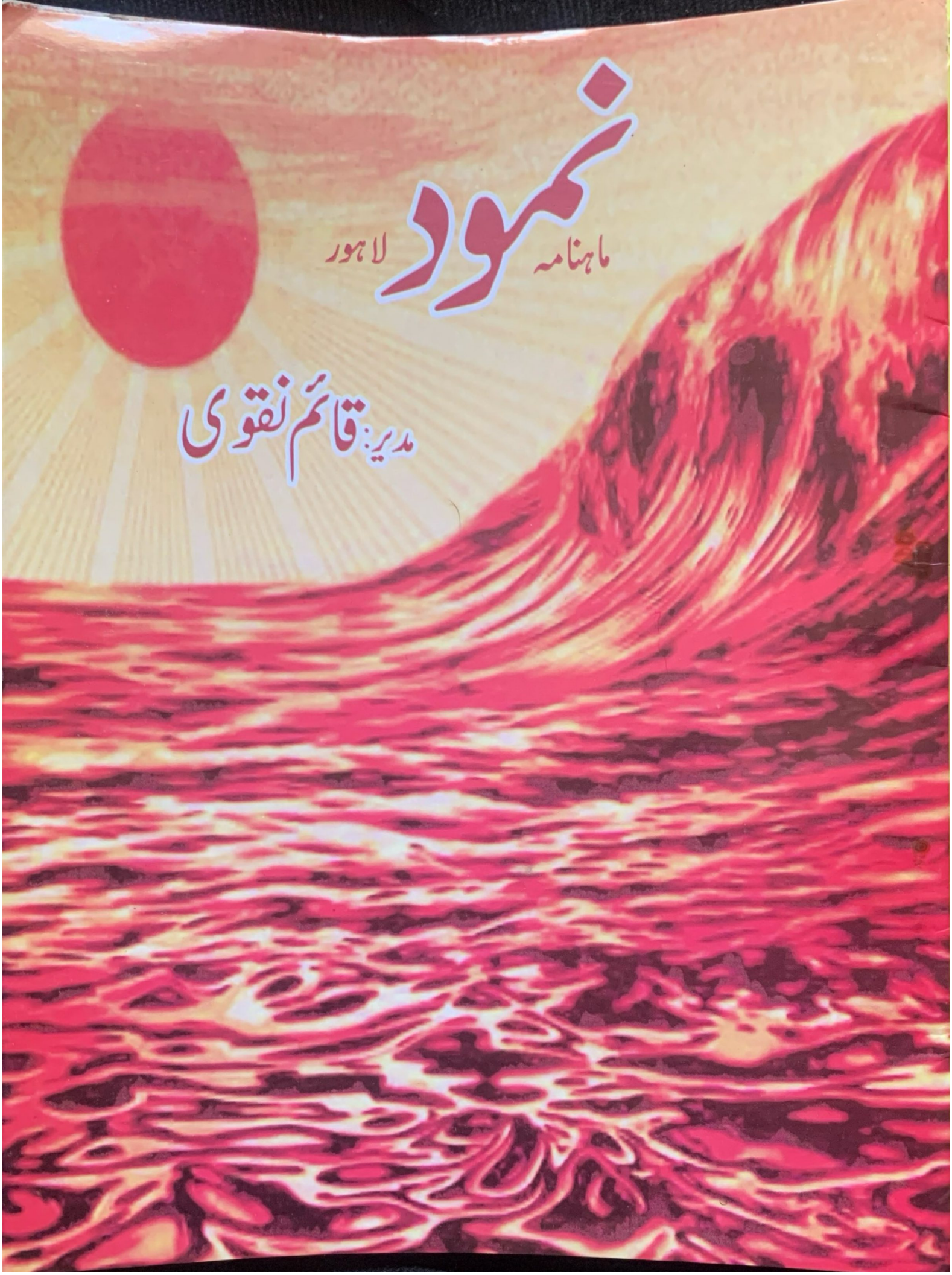


Scanned with CamScanner

ماہنامہ نمود لاہور



شہزاد ملک، قائم نقوی، شفیق سلیمی



پروفیسر سید محمد اکبر، سید ناصر شہزاد مدیر: قائم ن

حاجی بشیر احمد بشیر،، اشرف قدسی

پروفیسر ارجمند احمد قریشی



محمد جان عاطف، محمد طارق خٹک

محسن احسان صاحب شام، خاطر غزنوی

خیال رومانی



مدیر: قائم نقوی

جلد 2 شمارہ 1-2-3

جنوری، فروری، مارچ 2014ء

قیمت فی شمارہ -/50 روپے

سالانہ چندہ بمعہ ڈاک خرچ -/600 روپے

بیرون ممالک: بمعہ ڈاک خرچ سو ڈالر

فون: 0331-4822941 , 0301-5253177

ای میل: sqimnaqvi@hotmail.com

پتہ: 56۔کوچہ سیف الملوک، سلیم سٹریٹ، چھپڑ سٹاپ، ملتان روڈ، لاہور

فہرست

اداریہ		۲
مضامین		
زمانہ ہمکلام ہوتا ہے	لطیف ساحل	۳
بیسویں صدی کے رجحان ساز شاعر	ڈاکٹر تقدیس زہرا	۱۴
بیادِ سید قاسم محمود	مظہر سلیم مجوکہ	۲۱
غزلیں		۳۱
مشکور حسین یاد، صفدر سلیم سیال، شفیق سلیمی، ایز د عزیز، آفتاب کاوش،		
جاوید قاسم، مظہر عباس چودھری		۳۳
افسانے		
نقش بر خاک	محمود احمد قاضی	۳۸
نور کی کہانی	مسرت کلانچوی	۴۳
غیر گھریلو عورت	فرخندہ شمیم	۵۲
غزلیں		
شاہین مفتی، تنویر قاضی، اوریا مقبول جان، اسلام عظمی		۵۶
فنونِ لطیفہ		
ماسٹر ناتھ	پروفیسر سلیم الرحمن	۵۸
آپ کا خط ملا		۶۸
نقد و نظر		۶۹

قائم نقوی نے نقوی برادرز پرنٹرز دربار مارکیٹ لاہور سے چھپوا کر چھپڑ سٹاپ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

اداریہ

''نمود'' کے اجراء پر احباب نے جس انداز میں پذیرائی کی۔اس کے لیے شکریہ کے الفاظ نہیں مل پا رہے۔شعروادب تو دل کی آواز ہے اور روح کا گداز ہے۔

علمی، ادبی تاریخ میں جرائد کی اشاعت کی روایت بہت پرانی اور توانا ہے۔ ہماری بھی یہی آرزو ہے کہ ہر عہد کے جرائد کی طرح لمحۂ موجود میں ''نمود'' بھی ادبی جرائد کی طرح اپنا مثبت کردار ادا کرے۔شعروادب کی زندگی، ترقی اور استحکام کے لیے ہمیں اپنا اپنا حصہ تو ڈالنا ہے اور ادب کے ساتھ کی ہوئی کمٹمنٹ کو بھی نبھانا ہے۔''نمود'' ادبی جرائد میں ایک عمدہ اضافہ ثابت ہوگا، انشاء اللہ ہماری کوشش ہے کہ ''نمود'' ادبی جرائد کی تاریخ میں اپنے کردار اور افکار سے اپنا نام اور مقام بنائے۔

آخر میں ایک بار پھر سب احباب کے تعاون کا شکریہ!

قائم نقوی

Scanned with CamScanner

زمانہ ہم کلام ہوتا ہے!

لطیف ساحل

تاریخ ہو یا ادب، زمانی تقسیم پر مکمل طور پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ زمانے کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، نہ ہی زمانہ ڈور کی مانند ہے کہ جہاں سے چاہیں، اسے کاٹ دیں اور جہاں سے چاہیں، گرہ باندھ دیں۔ جب انقلاب آتا ہے تو ماضی کے سایے کسی نہ کسی طور پر حال کے منظر نامے سے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔

ہجر و وصال میں یوں ہی معلق کیوں نہ رہیں ہم
گزرا موسم، اگلی رُتوں تک آ جاتا ہے

پاکستان کی تاریخ کو دیکھ لیجئے، آزادی کے حصول کے باوجود ہمارا نظامِ حکومت، انگریزی زبان کے تسلط سے آزاد نہیں ہو سکا۔ اردو زبان، محض رابطے کی زبان بنی ہوئی ہے اور انتظامی شعبوں میں اسے ابھی تک نظر انداز کیا گیا ہے۔

ادب کا مسئلہ بھی تاریخ سے مختلف نہیں۔ پاکستان کے حصول کے بعد انہی ادبی تحریکوں کا تسلسل جاری رہا جو ۱۹۴۷ء سے پہلے اپنی بنیادیں مستحکم کر چکی تھیں۔ یہ زمانہ رومانوی ادب کے اختتام اور ترقی پسند ادب کے عروج کا زمانہ تھا۔ شعر و ادب میں موضوعات، ہیئت اور فکری رجحانات کی تبدیلی آ رہی تھی۔ سرسید کی اصلاحی تحریک اور انجمن پنجاب کی موضوعاتی شاعری پس منظر میں جا چکی تھی۔ داستانوی ادب کو تاریخ کے منقش چوکھٹوں میں سجا دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ڈراما، ناول اور افسانہ قبولیت عام کی سند حاصل کر چکے تھے۔

قیام پاکستان کے فوری بعد ادب کے مذکورہ رجحانات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ آئی۔ مغربی ادب کی پیروی میں آزاد نظم، نثری نظم اور تنقید کے جدید رجحانات مزید نمایاں اور مستحکم ہوتے چلے گئے۔ درست طور پر کہا جاتا ہے کہ ادیب کو آنے والے حالات کا اندازہ قبل از وقت ہو جاتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک دراصل ۱۹۴۷ء کے مبارک لمحے کو خوش آمدید کہنے کا اہتمام و انصرام تھی۔ یہی سبب ہے کہ ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین نے عالمی کانفرنس منعقد کرتے ہوئے مغربی ممالک کی طرف دیکھنے کی بجائے روسی ادیبوں کو مدعو کیا۔ اگر وقت کو کاٹا جا سکتا، ایک نئے دور کا آغاز کیا جا سکتا، ماضی کے سایوں کو مکمل طور پر مٹایا جا سکتا تو یقیناً ترقی پسند تحریک کا

مقام، ادب اور تاریخ میں اس مقام سے بہت نمایاں ہوتا جو اسے آج تک دیا گیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ادیبوں کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک بھی دو دھڑوں میں بٹ گئی پاکستان اور ہندوستان کے ترقی پسند ادیب اور ایک دوسرے سے کٹ گئے۔ یہ بٹوارا زمین کے بٹوارے کا عمومی نتیجہ تھا۔ ترقی پسندوں کے اندرونی اختلافات کا اندازہ سردار جعفری کی اس بات سے ہو سکتا ہے:

"میں نے اپنے نقطۂ نظر سے کتاب لکھی ہے، اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا سرکاری ترجمان نہیں ہوں۔" (ترقی پسند ادب، دیباچہ طبع دوم ۱۹۵۰ء)

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ادب کو علاقائی سرحدوں سے مشروط کیا جانے لگا تھا۔ پاکستانی ادب اور ہندوستانی ادب کی ابتداء ترقی پسند تحریک میں پیدا ہونے والی دراڑ سے شروع ہوئی۔ پاکستانی ترقی پسند ادیب اور ہندوستانی ترقی پسند ادیب، دو مختلف راستوں پر گامزن ہو گئے۔ علی سردار جعفری نے جو یہ کہا تھا کہ "ترقی پسند تحریک کا ایک بین الاقوامی رشتہ بھی ہے جو قومی حدود اور جغرافیائی سرحدوں کو توڑ دیتا ہے اور انسانیت کا ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جو انصاف، محبت اور آزادی کے جذبے سے سرشار ہے اور ایک قوم یا دوسری قوم کی برتری کا قائل نہیں ہے۔" غلط ثابت ہوا اور پاکستانی ادیبوں کو نظر انداز کر کے انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ادب کے دیگر نظریات سے عمومی تعصب رکھنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی ترقی پسند ادیبوں سے خصوصی تعصب بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ٹیگور، پریم چند، دلاتھول اور جوش ملیح آبادی کو (جو اس وقت تک ہندوستان میں تھے) ترقی پسندوں کا ہیرو بنا کر پیش کیا اور احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، احمد راہی اور عارف عبدالمتین بتدریج ان کی تحریروں سے غائب ہوتے چلے گئے۔

علی سردار جعفری نے ترقی پسند ادیبوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے گروہ میں ترقی پسند تحریک کے بانی ادیب ہیں جن میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، پریم چند اجوش ملیح آبادی، ٹیگور، حسرت موہانی، ڈاکٹر عبدالحق، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی اور ساغر نظامی کے نام شامل ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کے دوسرے گروہ میں کرشن چندر، مجاز، جان نثار اختر، اوپندر ناتھ اشک، سبط حسن، جذبی، احمد عباس، اختر حسین رائے پوری، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین، رشید جہاں، فیض، اکٹر تاثیر، ڈاکٹر علیم، احمد علی، اختر انصاری اور چند دوسرے غیر معروف نام شامل ہیں۔ تیسرا گروہ جنہوں نے ۴۲-۱۹۴۱ء میں عملی طور پر اس تحریک میں حصہ لیا۔ ان میں احمد ندیم قاسمی کے علاوہ عزیز احمد، کیفی اعظمی، وامق جونپوری، ساحر لدھیانوی، عبادت بریلوی، حمید اختر، ابن انشاء، عبداللہ ملک، ظہیر کاشمیری، فکر تونسوی، مجروح سلطان پوری، نیاز حیدر، مہندر ناتھ، ہنس راج رہبر، اختر الایمان، مخمور جالندھری، غلام ربانی تاباں، ممتاز حسین انور، ابراہیم جلیس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مسرور اور بلونت سنگھ کے نام شامل کیے گئے ہیں۔

پہلے گروہ میں چند ادیب تو وہ ہیں جنہوں نے صرف پہلی ترقی پسند کانفرنس میں شرکت کی اور بس! ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور

حسرت موہانی جیسے بزرگوں کا نام صرف ''برکت'' کے لئے اس گروہ میں شامل کیا گیا۔ پریم چند کو اس لیے ہیرو بنایا گیا کہ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں منعقد ہونے والے ترقی پسندوں کے پہلے اجلاس کی صدارت کی، حالانکہ اسی سال ان کا انتقال ہو گیا اور وہ عملی طور پر اس تحریک میں بالکل حصہ نہ لے سکے۔ جہاں تک اردو کے فروغ کے سلسلے میں ان کی کوششوں کا تعلق ہے انہوں نے اردو افسانہ نگار ہونے کے باوجود اردو کی بجائے ہندی اور سنسکرت کو اہمیت دی۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں تاجور نجیب آبادی کے شہرہ آفاق رسالہ ''شاہکار'' میں جب سید حسن ریاض (ایڈیٹر اخبار ''نوید'' لکھنؤ) کا افسانہ شائع ہوا جس میں افسانہ کے مرکزی کردار کو اردو زبان کی ترویج کے سلسلے میں کوشاں ظاہر کیا گیا تو پریم چند نے اس افسانے کی مخالف کرتے ہوئے ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کی حمایت میں ایک مضمن لکھا جو شاہکار کے شمارہ دسمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو سردار جعفری کا پریم چند کو اردو زبان اور خاص طور پر ترقی پسندوں کا ہیرو بنا کر پیش کرنا حقائق فراموشی کے سوا کچھ نہیں۔ جہاں تک ٹیگور کا تعلق ہے ان کا حال بھی پریم چند سے مختلف نہیں۔ انہیں ترقی پسندوں کی دوسری کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۸ء کا افتتاحی خطبہ لکھنے کا موقع ملا۔ بنگالی کی نسبت اردو سے ان کی دلچسپی انتہائی معمولی تھی۔ ادیبوں کے دوسرے اور تیسرے گروہ کی تشکیل کے سلسلے میں بھی سردار جعفری نے محض فہرست سازی کی ہے اور سعادت حسن منٹو، ابن انشاء اور عبادت بریلوی جیسے ادیبوں کو بلا امتیاز ترقی پسند قرار دے دیا ہے۔

علی سردار جعفری نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں کا سرخیل بننے کی کوشش کی۔ انہوں نے ''ترقی پسند ادب'' کے عنوان سے کتاب ترتیب دے کر تعصّبات کی بنیاد رکھی اور ایک حسرت ناتمام کے ساتھ اس تحریک کو دفنا دیا۔ اب ترقی پسند تحریک تھی، پاکستانی ادیب تھے اور سرزمین پاکستان۔

قیام پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں میں ترقی پسند تحریک کے جوبن کا زمانہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ''ادب برائے ادب'' کی روایت بھی چلی آ رہی تھی۔ ایسے ادب کی گنجائش اس لیے موجود تھی کہ جب تک کسی بھی زبان کا لسانی تشکیلات کے مراحل طے نہ ہوں ادب برائے ادب کا نظریہ کسی نہ کسی طور پر کارفرما رہتا ہے۔ ترقی پسند ادب اور روایتی ادب کے ساتھ ساتھ ادب کے نوخیز غنچوں نے بھی جنم لیا تھا جن میں پاکستانی ادب اور اسلامی ادب نمایاں تھے لیکن ابھی صرف نام کی حد تک تھے۔ اس صورت حال میں ترقی پسندوں کو بہت بڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے کچھ سیاسی محرکات بھی تھے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو یہ چاہتے تھے کہ انگریزی سامراج کے خاتمے کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے اسے روس پُر نہ کر پائے۔ چنانچہ جہاں ترقی پسند، محنت کشوں کی حمایت کی بات کرتے تھے، وہاں مغرب پرست، عوام دوستی کا نعرہ لگاتے تھے۔ جس کا مقصد تھا جمہوری نظام حکومت جو اشتراکی نظام حکومت کے مقابل سمجھا جاتا ہے۔ (بعد میں عوام دوستی کا نعرہ بھی ترقی پسندوں کے منشور میں شامل ہو گیا۔) جہاں ترقی پسند، ترقی پسندی کی بات کرتے تھے، وہاں مغرب پرست، روشن خیالی کا نظریہ پیش کرتے تھے۔ یہ ایک کھلی جنگ تھی جس کی ابتدا ترقی پسندوں نے خود کی تھی اور غیر جانبداری کو مکروہ فعل قرار دیا

تھا۔ بقول عارف عبدالمتین:

''طبقاتی شعور اور بین الاقوامی سیاست کی حقیقی سمجھ بوجھ نے ہماری غیر جانبداری کو قطعاً ختم کر دیا ہے اور ہمارے ترقی پسند فنکار علانیہ طور پر عوام دوست ممالک کا ساتھ دینے لگے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے ادب، ہماری تحریک اور ہمارے مشن کے لئے نہایت نیک فال ہے۔'' (سویرا ۷-۶)

جب جانبداری اور پہچان کا نعرہ بلند ہوا تو ادب میں ایک نئے گروہ نے جنم لیا جسے ''شہوانیات اور لاشعور کے لکھنے والے'' کا نام دیا گیا۔ اس گروہ کے ادیب زیادہ تر حلقہ ارباب ذوق سے منسلک تھے۔ سعادت حسن منٹو اس تگڑم میں ہر طرف گھوم جاتے تھے۔ ان کی تحریریں شہوانیات کا نمونہ سمجھی جاتی تھیں، لیکن منٹو حلقہ ارباب ذوق کے گروہ میں شامل نہیں تھے۔ ان کی زیادہ تر تحریریں ترقی پسند ادیبوں کے رسائل میں شائع ہوتی تھیں اور ترقی پسند ادیب انہیں اپنا ساتھی سمجھتے تھے جبکہ عملی طور پر وہ حسن عسکری کی پاکستانی ادب کی تحریک سے وابستہ تھے اور ان کے ساتھ مل کر رسالہ ''اردو ادب'' مرتب کرتے تھے۔

جب ''سویرا'' کی اشاعت کا تسلسل کمزور پڑا تو ترقی پسندوں نے ''نقوش'' کو اپنی ہاتھوں میں لے لیا۔ جانبداری اس انتہا تک پہنچی کہ رسالے بھی گروہی ادب کی نمائندگی کرنے لگے۔ ادیبوں کے آپس میں شخصی رابطے تھے، قلمی تعاون مفقود تھا۔ ترقی پسندوں کو خاص طور رتاکید تھی کہ وہ اپنی کوئی تحریر کسی غیر متعلقہ رسالے کو ارسال نہ کریں۔ چنانچہ حسن عسکری اور سعادت حسن منٹو کی زیر ارادت شائع ہونے والے ''اردو ادب'' میں عارف عبدالمتین کا یہ خط شائع اور سعادت حسن منٹو نے اسے ''حقہ پانی بند'' کا عنوان دیا۔

''بھائی جان تسلیم!

میرا منظوم ڈرامہ کچھ مدت سے آپ کی تحویل میں ہے۔ میں متعدد مرتبہ مسودہ حاصل کرنے کے لئے چوہدری صاحب سے ملا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد میں علیل ہو گیا..... براہ کرم ڈرامے کا مسودہ مجھے لوٹا دیجئے۔ اب ''اردو ادب'' میں اسے شائع کروانا میرے لئے بالکل ممکن نہیں رہا کیونکہ مجھے رات اطلاع ملی ہے کہ میری علالت کے دوران میں ہماری انجمن نے بعض ادباء سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا ہے۔ ذاتی طور پر میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے اور میں آپ کا احترام کرتا ہوں لیکن انجمن کے ایک ذمہ دار رکن کی حیثیت سے اس کے فیصلوں کا احترام مجھ پر فرض ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ڈرامے کی اشاعت رکوا کر مجھے اس فرض کی تکمیل میں مدد فرمائیں گے۔ شکریہ!

عارف عبدالمتین

لاہور ۹ ستمبر ۱۹۴۹ء

(اردو ادب، شمارہ ۲ صفحہ ۳۱۶)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے انتظامی فیصلے کس قدر بے لچک ہوتے تھے۔ اسی شمارے میں اسی طرح کا ایک اور خط احمد ندیم قاسمی نے بھی منٹو کو تحریر کیا اور خط کی اشاعت سے انہیں باز رہنے کے لئے کہا گیا۔

سعادت بھائی، سلام محبت!

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں ۲۴ اپریل سے علیل ہوں۔ آپ کی مجوزہ دوا کا اشتہار مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ بہر کیف اس امر کا مجھے افسوس رہا کہ آپ مجھے پوچھنے تک نہ آئے۔ آپ کو اس بات کا تو یقیناً احساس ہوگا کہ یہ شکایت کرتے ہوئے میں حق پر ہوں۔

۱۵ اگست کو ''نقوش'' کا ضخیم آزادی نمبر آ رہا ہے۔ اگر اس کے لئے آپ کوئی کہانی مرحمت فرما سکیں تو یہ آپ کا بہت بڑا کرم ہوگا۔ میں یہاں کوئٹہ ہی میں آپ کی عنایت کا منتظر ہوں گا۔''

احمد ندیم قاسمی

برادرم سعادت، سلام مسنون!

مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میرا وہ خط جو میں نے کوئٹہ سے لکھا تھا اپنے رسالہ ''اردو ادب'' میں شائع کر رہے ہیں۔ میرے اس خط کی اشاعت روک لیں۔ جب میں آپ سے افسانہ طلب کیا تھا تو ہماری انجمن (انجمن ترقی پسند مصنفین) نے ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کر رکھی تھی کہ وہ رسالے جنہیں ترقی پسند ادب کی نمائندگی کا دعویٰ ہے، ایسے ادیبوں کی تحریریں شائع نہ کریں جنہیں ترقی پسند ادب کی تحریک سے اتفاق نہیں۔ اب یہ فیصلہ ہو چکا ہے اور میں انجمن کے منشور، آئین اور فیصلوں کا پابند ہونے کے باعث یہ نہیں چاہتا کہ میرا وہ خط پڑھ کر ہماری تحریک کے ہمدرد الجھن میں پڑ جائیں۔ امید ہے آپ میرا وہ خط روک لیں گے اور اگر ایسا ناممکن ہو تو یہ خط بھی شائع کر دیں ہے۔ شکریہ! والسلام

احمد ندیم قاسمی

لاہور ۱۹ ستمبر ۱۹۴۹ء

احمد ندیم قاسمی کے دوسرے خط کے اندراج سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی پسندوں نے منٹو کو غیر ترقی پسند قرار دیتے ہوئے اس کی تحریروں کو ''نقوش'' کے آزادی نمبر میں شائع کرنے سے گریز کیا۔

''اردو ادب'' کی اشاعت حالات اور نظریات کی متوقع تبدیلی کی طرف واضح اشارہ تھی چنانچہ اس رسالے کی اشاعت کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی:

''اردو ادب شائع ہونا تو دور رہا، ابھی پوری طرح مرتب بھی نہیں ہوا تھا کہ دنیائے ادب میں ایک افسانہ بن گیا۔ کسی کو خطرہ پیدا

ہوا کہ رجعت پسندوں کا محاذ بن رہا ہے، کسی کو دھڑکا ہوا کہ یہ کوئی پیری مریدی کا سلسلہ ہے۔ کسی کو پتہ چلا کہ یہ رسالہ پاکستان کی حکومت کا ایجنٹ ہوگا۔ اسی رسالے کے دم سے اردو میں ایک نئی صنف ادب ''کھلے خط'' کا اضافہ ہوا۔ غرض لوگ طرح طرح سے کھلے، البتہ ان حضرات کی ایک بات تو سچی نکلی۔ کم سے کم پنجاب کی حکومت نے ضرور اس رسالے پر نظر عنایت فرمائی۔ خیر یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ ''ساقی'' شائع کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے شاہد احمد صاحب کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ مگر ہم نے ان کے تجربے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور یہی سمجھتے رہے کہ زیادہ سے زیادہ دیر ہوگی، اندھیر تو نہیں ہوگا۔ ہم نے کہیں جون ۴۸ء میں کام شروع کیا تھا، لیکن جب چھ مہینے ہونے کو آئے اور مرتب شدہ پرچے میں رکھے رکھے پھپھوندی لگ گئی تو حکومت کے دفتر نے ''جلد'' اجازت دینے کا جو وعدہ کیا تھا، وہ شرمندۂ تکمیل ہوتا نظر نہ آیا۔ تھک ہار کر ہم نے کراچی سے رجوع کیا اور گھنٹے بھر کے اندر اندر اجازت حاصل کر لی۔ پنجاب حکومت کو یہ بے صبری اور بے اعتباری ناگوار گزری اور پرچے کا جو حصہ لاہور میں چھپ چکا تھا اسے پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے بعد چھ مہینے اور گزر گئے۔ نہ تو ہمیں یہ بتایا گیا کہ آخر یہ کس گناہ کی پاداش ہے، نہ مقدمہ چلایا گیا۔ ہم مختلف ''سرکاروں'' میں عرضیاں گراتے پھرے، مگر وہ کان ہی نہ نکلے جن پر ''اردو ادب'' کی جوئیں رینگ سکتیں۔ خدا خدا کر کے عدالت میں مقدمہ پیش ہوا اور چالیس روپیہ جرمانہ بھرنے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ ہمارا جرم یا کہ ہم نے لاہور سے اجازت لئے بغیر پرچہ ''شائع'' کر دیا تھا۔ یہ ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ ''چھپوانا'' اور ''شائع'' کرنا کب سے مترادف الفاظ ہو گئے ہیں۔ کوئی نیا اور سیکھتڑ پبلشر ہوتا تو ایک بات بھی تھی مگر جو پبلشر کئی سال سے کتابوں کا کاروبار کر رہا ہو اور قاعدے قانون سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا ہو، وہ اجازت لیے بغیر رسالہ شائع کرنے کی جرأت کر ہی نہیں سکتا۔ بہر حال جو کچھ ہوا، سو ہوا۔ ہمیں نہ تو شکایت ہے نہ رنج، نہ غصہ۔ ادب کے راستے میں ایسے روڑے ہمیشہ آتے رہتے ہیں۔ نہ اس چھوٹے سے واقعے سے ہماری بنیادی پالیسی میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ ہم رجعت پسند ہیں یا سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں یا خود پرستی کے مبلغ ہیں یا کیا ہیں؟ یہ سب ہمارا پرچہ بتائے گا۔

سعادت حسن منٹو

محمد حسن عسکری

(اردو ادب شمارہ ۱ اداریہ)

''اردو ادب'' میں چند نامور ادیبوں کے جو ایک سطری خاکے تحریر کیے گئے ان کی حیثیت آج بھی مسلمہ ہے۔

قلم قتلے

۱۹۴۹-۵۰ء کے سیاہ حاشیے۔ میراجی! غلام باری!! سر عبدالقادر!!!

گھر کا رستہ بھول گیا

نام ثناءاللہ۔۔۔ میراجی تخلص، حلقۂ اربابِ ذوق کا بانی۔۔۔ لاہور میں پیدا ہوا، بمبئی میں دفن ہوا۔
نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستہ بھول گیا۔

باری تعالیٰ کی مرضی

غلام باری۔۔۔ باری علیگ۔۔۔ اشتراکی ادیب۔۔۔ مصنف، انقلاب فرانس، کمپنی کی حکومت۔۔۔ صحافی، دوست۔۔۔ قہوہ خانوں کی رونق۔۔۔ میو ہسپتال میں ۱۱ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ختم ہو گئی۔

سر عبدالقادر

شیخ اردو، شاعر گر، ادیب ساز، بانی مخزن۔۔۔
۹ فروری ۱۹۵۰ء کو غریبِ اردو ہو گئے۔

آغا حشر کاشمیری (مرحوم)

آغا، کس حال میں ہے
شیر بلی کے جال میں ہے

انجم رومانی

اصلی نام فضل دین۔۔۔ باپ معمار، بیٹا ریاضی کا پروفیسر اور شاعر۔ خشتِ کج۔۔۔ خشتِ کج

نون میم

ن م راشد۔۔۔ نذر محمد۔۔۔ بے قافیہ شاعری کے نظر بتوا

ممتاز مفتی

مفت میں ممتاز، نقد میں اعلیٰ

کنہیالال کپور

آسمان سے گرا اور ہندوستان میں ایک کھجور جس کا نام موگا ہے اس پر لٹک گیا۔

عشرت رحمانی

بچوں کے شاعر۔۔۔بوڑھوں کے سوانح نگار۔۔۔ماہر حشریات

ابوسعید قریشی

اپنا الّو آپ۔۔۔تازہ تخلیق ''ڈرپوک''

یوسف ظفر

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

قیوم نظر

حلقۂ اربابِ ذوق کے یاحیٔ یاقیوم

تازہ واردان

نام اشفاق احمد خان۔۔۔جائے پیدائش، سکھوں کا متبرک شہر مکسر۔۔۔تقسیم پر ہجرت کی تو خان وہیں رہ گیا۔۔۔اب صرف اشفاق احمد۔۔۔باپ سلوتری۔۔۔ہارس۔۔۔یعنی اپسی حس ورثے میں آئی۔۔۔موجودہ مشاغل، برف سازی اور افسانہ نویسی۔'' (اردو ادب شمارہ ۲ ۱۹۴۹ء صفحہ ۵-۴)

محمد حسن عسکری نے تراجم کے ذریعے عالمی ادب کا رابطہ اردو ادب سے استوار کرنے کی جو کوشش کی، اس کے دُور رس اثرات نکلے۔ عسکری نے اپنی مخصوص ترجیحات کے باعث اپنی توجہ مغرب کی طرف رکھی۔ کرسٹفر اشروڈ کے انگریزی ناول کا ترجمہ ''آخری سلام'' اور گستاؤ فلوبیئر کے فرانسیسی ناول کا ترجمہ ''مادام بوواری'' اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے روسی ادب کو اردو میں متعارف کرانے کی بھرپور کوشش کی۔ مخمور جالندھری نے میکسم گورکی کے ناول کا ترجمہ ''ماں'' کے نام سے کیا اور مائیکل شولوخوف کے ناول ''اور ڈان بہتا رہا'' کا ترجمہ بھی انہوں نے کیا۔ اس طرح اردو زبان و ادب کے رابطے مشرق و مغرب کے ساتھ ساتھ شمال سے بھی بحال ہو گئے۔ ان تراجم کو پڑھ کر اردو کے ادیبوں کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ حقائق نگاری کے ساتھ ساتھ انقلاب کی بات بھی سمجھ میں آنے لگی۔

''آخری سلام'' کا انگریز مصنف اس دور کے افسانہ نگاروں میں بہت مقتدر حیثیت رکھتا ہے۔ پچھلے بیس برس میں شاید ہی کوئی ایسا کوئی افسانوی کتاب شائع ہوئی ہو جو حقائق نگاری میں آخری سلام پر فوقیت رکھتی ہو۔ اصل کے تاثر کو حسن عسکری نے بڑی خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ آخری سلام موجودہ زمانے کا سب سے اچھا ترجمہ ہے۔'' (ڈاکٹر تاثیر)

اور ڈان بہتا رہا

''روس کے وہ تمام پہاڑ، وادیاں، جنگل، دریا، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، بچے، وہ تمام محبتیں، نفرتیں، قربانیاں جن کے باہمی عمل اور ردعمل نے روس کے عظیم الشان انقلاب کو جنم دیا۔ اس کتاب میں نہ صرف ہُو بہُو دکھائی دیتے ہیں بلکہ ہُو بہُو محسوس ہوتے ہیں۔ یہ ناول انقلاب کا آئینہ ہے۔ تُند، سریع الحرکت، پُر ہیبت اور طوفانی۔۔۔'' (فیض احمد فیض)

اور ڈان بہتا رہا

''روس کی اس نسل کی سوانح حیات ہے جو انقلاب سے پہلے پلی بڑھی، لیکن انقلاب کی آگ میں یوں تپ کر نکلی کہ ایک عالم میں اجالا ہو گیا۔ اردو ادب میں ایسے حیات پرور ادب کی بڑی ضرورت ہے۔'' (اختر حسین رائے پوری، اردو ادب شمارہ ۷)

پاکستان اور ہندوستان میں روسی ادب کو مقبول بنانے اور اردو کے ادیبوں کی نگاہیں مغرب کی طرف سے ہٹانے کے لئے روسی زبان سے اردو میں ترجمہ کا خاص اہتمام کیا گیا۔ دارالاشاعت ترقی تاشقند کے ذریعے افسانوی ادب، کہانیاں، ناول اور شاعری کی بے شمار کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ منظر سلیم نے روسی شاعری کے اردو زبان میں متعدد منظوم ترجمے کیے۔

ادب کے عالمی رابطے کی اس مہم میں حلقۂ ارباب ذوق کے اراکین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے نہ صرف مختلف زبانوں کی ادب کو اردو میں منتقل کیا بلکہ مشرق و مغرب کے دیگر ممالک میں اصنافِ ادب اور ہیئت کے جو تجربے ہو رہے تھے، انہیں بھی اردو میں متعارف کرایا۔ ابھی تک تو فکشن اور شاعری کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ قیوم نظر نے ٹی ایس ایلیٹ پر لکھی گئی لیونارڈ انگر کی تعارفی اور تنقیدی کتاب کو اردو میں ترجمہ کر کے تنقیدی مضامین کے تراجم کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ حالی کے بعد قیوم نظر پہلی ادیب تھے جنہوں نے ادب کے اس پہلو کو نمایاں کیا۔ حلقۂ ارباب ذوق کے ادیبوں کے اس پہلو کو نمایاں کیا۔ حلقۂ ارباب ذوق کے ادیبوں نے فکر و فلسفہ کی نئی راہ نکالی۔ ترقی پسند، شعور اور دانش کی بات کرتے تھے۔ پاکستانی اور اسلامی ادب کے مبلغین، تاریخی اور تہذیبی شعور کو اہمیت دیتے تھے۔ نئے ادب کے پرستاروں نے تحت الشعور اور لاشعور کی اہمیت پر زور دیا۔ ترقی پسندوں نے شعوری کوشش اور تخلیقی تجربہ کو ہم معنیٰ بنا دیا۔ لہٰذا تخلیقی تجربہ کو لاشعور اور تحت الشعور سے استوار کرنے کی سلسلے میں حلقۂ ارباب ذوق کے ادیبوں اور پاکستانی اور اسلامی ادب کے مبلغین کے درمیان فکری اتحاد پیدا ہو گیا۔ ترقی پسندوں نے اس تحریک کے خلاف خوب خوب لکھا اور نئی تخلیقی رو کو سمجھے بغیر سچے جھوٹے

تمام الزامات ان پر تھوپ دیے۔

''اسی زمانے میں ایک اور گروہ نے سر اٹھایا۔ ہیئت پرست، ابہام پرست اور جنس پرست ادیب تھے۔ جن کے مشہور نمائندے میراجی، یوسف ظفر، ممتاز مفتی اور مختار صدیقی وغیرہ تھے۔ یہ ذہین اور ہوشیار لکھنے والے تھے جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے اور شعور کے بجائے تحت الشعور اور لاشعور پر اور معنویت اور مواد کو چھوڑ کر ہیئت اور اسلوب پر زور دیتے تھے۔ یہ لوگ کھلم کھلا ترقی پسند تحریک کے مخالف تھے اور اس کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک الگ انجمن ''حلقۂ ارباب ذوق'' کے نام سے قائم کر لی تھی جو لاہور اور دہلی تک محدود تھی لیکن ترقی پسندوں کی تحریک سے زیادہ منظم تھی۔ ان کی بنیاد یہ تھی کہ ادب کا سماج سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی رومانیت مجہول اور گندی تھی۔ یہ خوابوں کو خارجی حقیقت سے الگ کر کے واہمے میں تبدیل کر دیتے تھے اور ان اندھے خوابوں سے جو جنسی تجربوں تک محدود رہتے تھے، ایک داخلی دنیا بناتے تھے۔ جس کے جغرافیے کا پتا لگانا معمولی انسان کا کام نہ تھا۔ ان کا ''انا'' کسی قسم کی سماجی ذمہ داری کو برداشت نہیں کرتا تھا جس کا لازمی نتیجہ ابہام، قنوطیت اور فرار تھا۔ آخر وہ جمالیات کی اس سطح پر اتر آئے جیسے ''عورت کا پیشاب کرنا'' اور فکر کی اس بلندی پر پہنچ گئے جہاں اس طرح کی شاعری ممکن ہے۔۔۔

گورے جسموں کو جواں رکھتے ہیں بندر کے غدود

(ترقی پسند ادب صفحہ ۲۰۵)

اردو ادب کے نئے رجحانات کو ٹھکرا کر ان چند نام نہاد ترقی پسندوں نے عملی طور پر ترقی اور تبدیلی کے بنیادی اصول کو نظر انداز کر دیا۔ اس مقام پر ترقی پسند مخصوص معنوں میں روایت پسند بن گئے کیونکہ انہوں نے ترقی پسندی کی روایت کے علاوہ ہر دوسری ادبی روایت کو رد کر دیا۔

نئے ادب اور نئے علم کی روشنی لانے والوں میں ایک طرف تو حلقۂ ارباب ذوق کے اراکین تھے اور دوسری طرف تعلیم یافتہ طبقہ تھا جن میں ن۔م راشد، ڈاکٹر تاثیر، حمید احمد خاں، عابد علی عابد، عبدالمجید سالک اور تصدق حسین خالد تھے جو اپنی انفرادی کوششوں کے باعث دانش اور علم کی نئی روشنی سے ادب کو سیراب کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے ادب کے فروغ کے لیے علم کے حصول کی ضرورت کو ایک تحریک بنا دیا۔ چنانچہ ان ادیبوں کے فکری رجحانات کے باعث ادب کا بہاؤ ادبی گروہوں میں مقید رہنے کی بجائے تعلیمی اداروں کی طرف منتقل ہو گیا۔ چنانچہ شہرت بخاری، افتخار جالب، جیلانی کامران، انجم رومانی، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سہیل احمد خان اور ڈاکٹر سعادت سعید اپنی اپنی انفرادیت کے باوجود علم و دانش کی اسی تحریک کو آگے بڑھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

عابد علی عابد اور تاجور نجیب آبادی نے دیال سنگھ کالج کو ادبی مرکز بنا دیا تھا۔ شہرت بخاری اور انجم رومانی جب تک اس کالج سے وابستہ رہے انہوں نے اس کی ادبی حیثیت کو برقرار رکھا۔ انجمن حمایت اسلام نے شعر و ادب کی جس تحریک کی داغ بیل اسلامیہ کالج

ریلوے روڈ میں ڈالی تھی، اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور نے اسے پروان چڑھایا۔ سجاد باقر رضوی نے یہاں ینگ رائٹرز کی بنیاد رکھی۔ حمید احمد خان اس کے طلباء کے لئے مثالی ادبی شخصیت تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد شعروادب میں جو نئی نئی تبدیلیاں رونما پذیر ہو رہی تھیں، پنجاب کی سرزمین ان کے لیے سب سے زیادہ سازگار تھی۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے جو لوگ کراچی اور دوسرے شہروں میں آباد ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ اردو ادب کی مستحکم روایات لے کر آئے تھے۔ انہیں اپنی زبان دانی پر زعم تھا اور ان کے رویے میں بدلتی ہوئی زبان کے لیے کسی لچک کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے نئے ادب کی ابتداء پنجاب اور خاص طور پر لاہور سے ہوئی اور یہیں پروان چڑھی۔ لاہور کو بجا طور پر پاکستان کا دل کہا جاتا ہے جس طرح جسم کے تمام حصوں سے خون دل کی طرف آتا ہے اور دل اسے دوبارہ جسم کے تمام حصوں کی طرف ارسال کر دیتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے تمام حصوں کے ادیب لاہور میں آتے ہیں، علم و دانش کی نئی روشنی کے بہاؤ کا حصہ بنتے ہیں اور دوبارہ پورے ملک میں پھیل جاتے ہیں۔

☆☆☆☆

☆ ادارے کا رسالے میں شائع ہونے والی تحریروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆ رسالے میں شائع ہونے کے لیے تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے۔

☆ شائع ہونے کے لیے ارسال کی جانے والی تخلیقات صفحے کے ایک طرف لکھی ہوں اور خوشخط ہوں۔

☆ تخلیقات کی فوٹو کاپی لکھاری اپنے پاس رکھیں اور اصل مسودہ ادارے کو ارسال کریں۔

☆ نمود کو برائے اشاعت ارسال کی گئی تخلیقات کو کسی اور رسالے کو نہ بھجوایا جائے، ذرا صبر سے کام لیا جائے۔

Scanned with CamScanner

بیسویں صدی کے رجحان ساز اُردو شاعر

ڈاکٹر تقدیس زہرا

اُردو شاعری کا دامن اپنے اسالیب اور موضوعات کے حوالے سے بہت وسعت رکھتا ہے۔ اس شاعری کو ایک طرف تو رجحان ساز اور صاحب اسلوب شعرا میسر آئے تو دوسری طرف ان شعرا نے موضوعات کے ضمن میں بہت سے تجربات کیے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو غزل اور نظم کا کینوس رنگا رنگ موضوعات سے اٹا پڑا ہے۔ اس کینوس کے سبھی رنگ روشن اور اُجلے ہیں۔ تاہم یہ موضوعات روایت اور جدت کے زمرے میں بآسانی تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ روایتی موضوعات میں بھی ذہنی اُپج پائی جاتی ہے مگر اس وقت اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اگر شاعری کے جدید مضامین پر نظر ڈالی جائے تو ان میں ایک حوالہ اساطیر اور تلمیحات کا بنتا ہے۔ میں نے اپنے اس مقالے میں اُردو شاعری میں اساطیر کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ تلاش کا یہ سفر بیسویں صدی کی شاعری کا احاطہ کرتا ہے چنانچہ مذکورہ صدی کے نمایاں، رجحان ساز اور اہمیت کے حامل شعراء کو اس مطالعے کے لیے چنا گیا ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ اساطیر کے موضوع نے شاعری کے اسالیب کو بھی روایت کے ساتھ ساتھ جدت عطا کی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان اساطیر کو اُردو شاعری کا حصہ بناتے ہوئے ایک طرف انھیں تلمیحات سے ملایا گیا ہے اور دوسری سطح پر انھیں علامات کے روپ میں ڈھالا گیا ہے۔ تیسری سطح ان اساطیر کے تاریخی حوالوں کی بنتی ہے اور چوتھا رُخ تہذیبی دائروں کی طرف لے جاتا ہے۔ ویسے تو داستانوی ادب میں چوتھے کھونٹ کی طرف سفر کرنے سے روک دیا جاتا تھا مگر اُردو شاعری کے یہ چاروں کھونٹ مل کر ہی اس کی معنویت اور اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

اُردو شاعری میں اساطیر کے بیان میں زمان و مکان کی وسعتیں پائی جاتی ہیں۔ انھیں رموز و علائم کے پیرائے میں بھی استعمال کیا گیا ہے اور علامتی حوالے سے بھی تاہم ہر دو صورتوں میں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اُردو شاعری میں اساطیر کی بہت سی جہات پائی جاتی ہیں۔ یہ جہات تہذیبی اور تاریخی حوالوں سے مل کر تشکیل پاتی ہیں۔ اس ضمن میں اسلامی، ایرانی، مصری، عربی، ہندوستانی، یونانی، رومی، سمیری، بابلی، آریائی اور دریائے سندھ کے کناروں کی تہذیبوں کے اساطیری حوالے ملتے ہیں۔ واضح رہے کہ مقالے میں اساطیر کے حقیقت یا خرافات ہونے کی بحث سے صرفِ نظر کیا گیا ہے اور محض ان کی اہمیت، افادیت اور اثر پذیری کو ذہن میں رکھا گیا ہے۔

اساطیر کی تلاش دراصل انسان کی اپنی تلاش اور کھوج کا سفر ہے۔ اس حوالے سے اچھے، بُرے، سچ یا جھوٹ کا سراغ نہیں لگایا گیا محض ان کے معانی واضح کیے گئے ہیں۔ اساطیر نے تہذیب اور تاریخ کے ساتھ ساتھ مختلف علوم وفنون سے بھی اپنا ناتا جوڑا ہے لہٰذا اساطیری حوالوں کے ڈانڈے علم نفسیات، علم بشریات اور علم فلسفہ سے بھی جا ملتے ہیں۔ ان علوم کی جدید اصطلاحات نے اساطیر کی قدیم کہانیوں کے معانی زیادہ بہتر اور واشگاف انداز سے بیان کیے ہیں چنانچہ مختلف خطوں کی یہ کہانیاں اور ان کے کردار ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہتے جس طرح انسان ایک وحدت کی لڑی اور انسانیت کے رشتے میں پرو دیے گئے ہیں۔ اسی طرح اساطیری کرداروں کے واقعات بھی آپس میں ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

درحقیقت دیو مالاؤں سے متعلق علم ہمیں کائنات، انسان اور اس کے باطن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ قدیم داستانیں زندگی کی اہم صداقتوں اور ناگزیر اقدار کی طرف رہنمائی کرتی رہی ہیں۔ جیسا کہ پچھلی سطور میں ذکر آیا کہ دیو مالاؤں یا اساطیر ہی سے مختلف علوم کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ لہٰذا ان کہانیوں میں ادراک اور آگہی موجود ہے۔ یہ اپنے اندر حقایق کا ذخیرہ رکھتی ہیں اور اس آگہی کا ادراک اُردو شاعری میں ملتا ہے جہاں اساطیر کو ٹھوس حوالہ بنا دیا گیا ہے۔ بقول عرش صدیقی:

"میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مائتھالوجی کی کہانیوں، ان کے دیوی دیوتاؤں کو آج سوائے متعلقہ قوم کے چند افراد کے، کوئی بھی حقیقت نہیں مانتا لیکن یہ حقیقت سب مانتے ہیں کہ انسانی شعور اور تہذیب کے ارتقا کی موجودہ صورت کو سمجھنے کے لیے مائتھالوجی کا سائنسی مطالعہ اور علمی تجزیہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔"(۱)

اسی بنا پر اساطیر اور دیو مالاؤں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ قدیم وجدید کا سنگم ہے۔ اس سے تہذیبوں کے دائرے ملتے ہیں۔ اس سے ماضی کا دھندلکا دُور ہوتا ہے۔ اُردو شاعری میں دیو مالاؤں کے حوالے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے پیچھے صدیوں کے سفر کی روداد ہے۔ اس روداد ہی میں دراصل رہنمائی پوشیدہ ہے۔

مریمی مورد تہمت رہی ارمانوں کی
ٹکڑے اک دفتر الزام ہیں دامانوں کے

(مختار صدیقی)(۲)

بیسویں صدی تک آتے آتے اُردو نظم نے کئی انداز بدلے۔ نظم نے اپنی روایتی کلاسیکی ہیئتوں سے ہٹ کر جدید ہیئتوں کو اختیار کیا چنانچہ پابند نظم نے آزاد اور معریٰ جیسی منفردہ ہیئتوں کو قابل اعتنا سمجھا تاہم جدید نظم زیادہ تر علامتی انداز کی حامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اس خطے کی تہذیبی اور تاریخی تبدیلیوں کا بھی خیر مقدم کیا اور انھیں اپنا کر اپنا کینوس وسیع کیا۔ آزاد، حالی، اکبر اور اقبال نے جدید نظم کا ڈول ڈالا تو اس کی روایتی ہیئت کو تو نہ بدلا ہاں موضوعات البتہ بدل ڈالے۔ موضوعاتی وسعت کے ساتھ ہی لفظیات کا نیا

ذخیرہ اور لہجے واسلوب کا نیا آہنگ اُردو نظم کو دیا۔ اس حوالے سے آزاد نظم اور اس کے کہنے والے سامنے آئے جنھوں نے اس نئی ہیئت کو وقار اور اعتبار بخشا۔ جدید عہد میں راشد، میراجی اور مجید امجد کی آزاد نظم نے بہت سی کروٹیں بدلیں۔ اس تبدیلی کو ۱۹۷۰ء کے بعد زیادہ شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جب شعرا نے ایک ہی نظم میں کئی اساطیری حوالوں کو علامت اور تلمیح کے پیرایے میں بیان کیا۔

اُردو غزل ہو یا اُردو نظم یہ تو طے ہے کہ بیسویں صدی کے متنوع اور ہنگامہ پرور واقعات کا ان اصناف نے لازمی اثر قبول کیا۔ غزل اپنی مخصوص ہیئت کے ساتھ موضوعات کا تنوع لے کر آئی جب کہ نظم نے موضوعاتی اور ہیئتی حوالے سے اُردو ادب کو انفرادیت اور وسعت عطا کی۔ ہر دو اصناف نے گزشتہ صدی کے اثرات کو اپنے تجربے اور اظہار کا حصہ بنایا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کی ابتداء سے رومانیت نے اُردو نظم کا دامن تھاما۔ اسی زمانے میں تاریخی واقعات، تلمیحات اور اساطیر نے شاعری میں اپنی جگہ بنائی۔ اقبال اس حوالے سے گزشتہ صدی کے پہلے شاعر سمجھے جاتے ہیں جن کے ہاں نئے انسان کے ذہنی، سماجی، اخلاقی، روحانی اور مذہبی مسائل کا احساس ملتا ہے (۳) اور وہ ان مسائل کا حل بھی بتا دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری کو ماضی اور حال سے مربوط رکھا اور روایتی شاعری کو نئے تخلیقی جوہر سے آگاہ کرتے ہوئے اسے علامت واستعارہ سے مملو کر دیا۔ سیاسی اور مذہبی حوالوں کو شبلی اور ظفر علی خاں نے بھی استعمال کیا۔

بیسویں صدی کے ربع اول کے بعد اُردو شاعری نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی اختیار کی۔ تاریخ کے اس موڑ پر ہمیں بیک وقت رومانی اور ترقی پسند ذہن رکھنے والے شعرا کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، مخدوم، کیفی اعظمی اور احمد ندیم قاسمی کے ہاں ہمیں تاریخی اور اساطیری حوالے ملتے ہیں۔ ان شعرا نے فرد کے ذاتی رجحان، رومان اور سماجی ناہمواریوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا (۴) جوش نے اقبال سے حد درجہ اثر پذیری قبول کی۔ اختر رومان میں الجھے رہے جب کہ حفیظ تاریخ کی طرف نکل گئے۔ فیض، ندیم اور دیگر شعرا نے ترقی پسند تحریک سے باقاعدہ وابستگی کے تحت بڑے خلوص اور انفرادیت سے سماجی مسائل اور تہذیبی اساطیر کو شاعری کا حصہ بنایا۔ یہ زمانہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے آس پاس کے زمانے میں کچھ ایسے شعرا سامنے آئے جو کسی بھی تحریک یا گروہ سے وابستہ نہ تھے مگر نظم کے میدان میں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے کچھ ایسی منفرد شاعری کی جس نے ان کے نام کو آج بھی زندہ رکھا ہوا ہے۔ ان شعرا میں تصدق حسین خالد، ن۔م۔ راشد، میراجی، مجید امجد اور اختر الایمان کے نام شامل ہیں۔ ان میں سے راشد عجمی تہذیب اور اساطیری حوالوں کو آزاد نظم میں لے کر آئے۔ راشد کے ہاں یہ تاریخی وتہذیبی واقعات علامتی معنویت میں ڈھل جاتے ہیں جب کہ میراجی ہندو دیومالا سے لگاؤ کی بدولت پہچانے گئے چنانچہ ان کے ہاں ہندوستانی دیومالا کی کثیر الابعاد معنویت کے اثرات زیادہ بھی ہیں اور گہرے بھی۔ تصدق حسین خالد نے تقدیر کے جبر اور مجید امجد نے وقت کے حوالے اپنی شاعری کے موضوع بنائے (۵) جب کہ اختر

لاایمان نے سماجی دائرے کو ملحوظ نظر رکھا۔ اس حوالے سے اساطیر کا بہت منفرد اور وقیع سرمایہ اُردو شاعری کے حصے میں آیا اور موضوعات کی وسعت نے ہیئتی تجربات کے ساتھ مل کر تنوع کی ایسی دنیا سے روشناس کروایا جو اس سے پہلے بالخصوص اُردو نظم کا حصہ بالکل نہیں تھی۔ ان شعراء کے ہاں اساطیری حوالے جدت اور انفرادیت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے تصدیق حسین خالد کی دو نظموں سے اقتباس ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

"ادب سے نام لیں میرا"

کہہ دو یہ جا کر دیوتاؤں سے
ادب سے نام لیں میرا
گلوں کے عنبریں سائے
کنار آب حیواں آج مجھ کو یاد کرتے ہیں (۶)

"یہ تماشا گہہ عالم کیا ہے"

عیش کیخسروی و طنطنۂ فغفوری
کہیں پرویز کے حیلے، کہیں چنگیز کے ظلم،
کہیں شبیری و ابراہیمی!
راز ہی راز ہے حیرت کدۂ بزم نمود،
تم چمن زار ہو، فطرت کے قریں رہتے ہو
یہ تماشا گہہ عالم کیا ہے؟ (۷)

۱۹۴۰ء ہی کے قریب حلقہ ارباب ذوق کی تحریک نے چند اور شاعر متعارف کروائے چنانچہ میراجی کے بعد قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی اور ضیا جالندھری نے اُردو ادب اور بالخصوص اُردو نظم پر توجہ دی۔ ان افراد نے مسائل کے بیان کے ساتھ ساتھ ہیئتی تجربات کو بھی نظم کا حصہ بنایا۔ حلقے کے شعرا نے انسانیت کو بھی نظم کا موضوع بنایا لیکن اساطیری حوالے اس عہد کے شعرا کے ہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ (۸) ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں ترقی پسند شعرا کا بول بالا رہا، ساتھ ہی اس تقسیم کے بعد فسادات عصری مسائل، قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے واقعات اور دیگر حوالوں نے شعرا کی توجہ کھینچ لی۔ اس زمانے سے غزل نے دوبارہ عروج پایا اور نظم کے شانہ بشانہ اپنی اہمیت اور معنویت منوائی۔ قیام پاکستان کے بعد کی نظم اور بالخصوص غزل کے حوالے سے فیض احمد فیض، احمد

ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، سیف الدین، عدم، قتیل شفائی، شہرت بخاری، شکیب جلالی، ناصر کاظمی، منیر نیازی، ابن انشاء شہزاد احمد، احمد فراز، ناصر شہزاد، سجاد باقر رضوی، احمد مشتاق اور ظفر اقبال جب کہ ہندوستان میں مجاز، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین اور ساحر لدھیانوی نے غزل میں اپنی پہچان کروائی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اساطیر کو علامت اور تلمیح کے پیرایے میں بیان کیا گیا اور اپنے عہد کے آشوب کو ان شعراء نے تاریخ اور تہذیب کے حوالوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ان شعراء کے بعد کی کھپ میں سلیم احمد، عبدالعزیز خالد، مصطفےٰ زیدی، رئیس امروہوی، جون ایلیا، افتخار عارف، حبیب جالب، افتخار جالب، محسن نقوی، خورشید رضوی، قائم نقوی، کے نام اہم ہیں۔ جب کہ خواتین میں ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، زہرہ نگاہ، پروین فنا سید اور پروین شاکر کے نام شامل ہیں۔

قائم نقوی کی ایک نظم کے اس ٹکڑے میں دیکھئے کہ اسطور نے کس طرح عصری آشوب کی علامت کا روپ دھار لیا ہے۔

"اے اسرافیل آ"

تمہیں خبر ہے
ہم اپنی پہچان کھو چکے ہیں
کہ اب تو شاہ و گدا سبھی
اپنے اپنے محلوں میں مطمئن ہے
بس ایک نکتے پہ متفق اور منتظر ہیں
کہ کوئی کب آ کے صور پھونکے (۹)

میراجی اور منیر نیازی کے بعد اساطیری علامتوں کو اپنی نظم کا حصہ بنانے میں جیلانی کامران، سہیل احمد خاں، محمد سلیم الرحمٰن اور سعادت سعید کے نام لیے جا سکتے ہیں جب کہ غزل میں ناصر شہزاد اور عبدالعزیز خالد کے نام اہم ہیں۔ ان تمام شعراء کے ہاں اساطیر نہایت خلوص اور انفرادیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ اساطیر کو شعر کا حصہ بناتے ہوئے ان شاعروں نے موضوع کے ساتھ ساتھ فن کے تقاضوں کو بھی کما حقہ پورا کیا ہے۔ تقسیم برعظیم پاک و ہند کے بعد سقوط ڈھاکا کے سانحے نے ادب کی ہر صنف کو متاثر کیا چنانچہ ثروت حسین، علی اکبر عباس، غلام حسین ساجد، نصیر احمد ناصر اور معین نظامی کے ہاں غزل اور نظم میں اساطیری حوالے الگ انداز سے برتے گئے جس کے لیے تاریخ اور تہذیب سے علامتیں اخذ کی گئیں۔ تہذیب کی ان علامتوں کو شعرا کا پیرایہ عطا کرنے میں ان تمام شعرا کا انفرادی اور قابل ذکر کام اہمیت کا حامل ہے۔

اس حوالے سے آزاد نظم کے جدید نمایندے معین نظامی کی نظمیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

"منطق الطیر"

مگر ایک دن
اک نگاہوں کی بولی کا ماہر پرندہ
مرے صحن میں آن اُترا
وہ طاؤس موعود کہنے لگا:
"میں ولی عہد سیمرغ ہوں
مرشد عام عنقا و قفقوس ہوں
قاف ادراک سے میری بعثت کا مقصد
فقط اس قدر ہے کہ میں
باغ تخلیق میں رہنے والوں کو
ان سب پرندوں کی بولی کا القا کروں!"
چنانچہ میں اُس طائر نور کے بال و پر چوم کر
اس کی چھاؤں میں چلنے لگا
وہاں سے میں اپنے پرندوں کی بولی سمجھنے کی لذت میں سرشار
واپس ہوا
تو مرے باغ متروک میں
میری حد نظر تک کوئی بھی پرندہ نہیں تھا (۱۰)

☆☆☆☆

"عشق کے ساتویں شہر میں"

محبت کے نشے نے جب میرے چہرے پہ سرخی، سفیدی کے بوسے سجائے
تو اس دور میں سات کمروں کی ہر خلوت خاص میں
میرے سب کرتے پیچھے سے پھٹنے لگے
اور پھلوں کی جگہ ہاتھ کٹنے لگے

یوں مرا زائچہ تنگ ہوتا گیا اور مجھے بستی والوں نے پُرکھوں کے گھر سے نکالا
مرے خانوادے کی پگڑی کو میری وجہ سے اُچھالا۔
مجھے تاج و تخت اور چتر و علم تج کے
اپنی مددگار بیوی کو اور اپنے ننھے سے بیٹے کو سوتا ہوا چھوڑ کر
ایک شب، ایک بے آب وادی میں بن باس لینا پڑا
میں اپنے وفادار بندر کو بھی ظالموں کے اسی گاؤں میں چھوڑ آیا
مجھے غار کے منہ پہ اک نیک مکڑی کے جالے نے اُس دن بچایا
وگرنہ وہ خونخوار بدو مجھے سونگھتے پھر رہے تھے (۱۱)

مندرجہ بالا نظم کے ایک ٹکڑے میں بیک وقت حضرت یوسفؑ، گوتم بُدھ، رام چندر اور پیغمبر آخر الزماں حضرت محمدؐ کے واقعات سے متعلق اساطیری اشارے ملتے ہیں۔ ان علامتوں نے تاریخ کے پردوں سے نکل کے زمانہ حاضر کے انسان اور اس کی سوچ کو متاثر کیا ہے۔ یہ علامتیں تہذیبی اور سماجی استعارے بن جاتے ہیں جن سے جدید انسان بھی کما حقہ، فیض یاب ہو سکتا ہے۔ یہ اساطیر محض تاریخ کا بیان نہیں بلکہ ہر عہد کے انسان کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔ رہنمائی کا یہ فریضہ اب ہم پر عائد ہوتا ہے کہ ہم انہیں کس زاویے سے دیکھتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ عرش صدیقی، ڈاکٹر۔ تکوین۔ لاہور۔: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء۔ ص ۲۸
2۔ مختار صدیقی۔ آثار۔ لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء۔ ص ۲۲
3۔ شمیم حنفی۔ جدیدیت اور نئی شاعری۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔ ص ۳۱۴
4۔ ایضاً۔ ص ۳۳۰، ۳۳۱
5۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ۔ اُردو نظم، انتخاب زریں (دیباچہ)۔ لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۷ء۔ ص ۱۸
6۔ تصدق حسین خالد۔ سرودِ نو۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔ ص ۱۶۲
7۔ ایضاً۔ ص ۲۳۵
8۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ۔ اُردو نظم، انتخاب زریں (دیباچہ)۔ ص ۱۹
9۔ قائم نقوی۔ زادِ ہجر۔ لاہور: گلریز پبلشرز، ۱۹۸۷ء ص ۵۵
10۔ معین نظامی۔ تجسیم۔ لاہور: خواب پبلشرز، ۱۹۹۶ء۔ ص ۹۱، ۹۲
11۔ ایضاً۔ ص ۱۰۴

Scanned with CamScanner

شاہکار ادبی تحریک کے بانی، صحرائے ادب کے مؤذن
میرے ''شاہ جی'' سیّد قاسم محمود میری نظر میں

مظہر سلیم مجوکہ

سیّد قاسم محمود کے نام سے میں 1970ء میں آشنا ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ میں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوا تھا اور انہیں دنوں اردو کے سب سے بڑے انسائیکلو پیڈیا ''معلومات'' کا قسط وار اجراء ہوا تھا۔ 36 صفحات پر مشتمل اس کی پہلی قسط یکم مئی 1970 کو شائع ہوئی تھی اور اُس وقت ایک قسط کی قیمت پچاس پیسے تھی۔ یہ انسائیکلو پیڈیا مجھے بہت اچھا لگا۔ اس کے مدیر اعلیٰ سیّد قاسم محمود تھے جو علم کی روشنی گھر گھر پہنچانے کا عزم لے کر میدان میں نکلے تھے۔ میں نے ''معلومات'' کی کافی اقساط کا مطالعہ کیا مگر یہ کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ 1972ء سے میں نے ماہنامہ ''سیارہ ڈائجسٹ'' کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کے مدیر اعلیٰ سید قاسم محمود تھے۔ مجھے یہ رسالہ بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ انتہائی معلوماتی مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔ سیّد قاسم محمود صاحب کے اداریے مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کے مضامین اور تراجم سے بھی میں بڑا متاثر ہوتا تھا۔ اسی اثناء میں میں اُن کے افسانوی مجموعے ''دیوار پتھر کی'' اور قاسم کی مہندی بھی پڑھ چکا تھا اور بطور افسانہ نگار بھی انہوں نے میرے دل پر انمٹ نقوش ثبت کیے۔ 1975ء تک سیارہ ڈائجسٹ کی تحریروں کی وساطت سے سیّد قاسم محمود سے رابطہ برقرار رہا۔ 1975 وہ تاریخی سال ہے جب یکم جنوری سے سیّد قاسم محمود نے پاکستان کی کتابی دنیا میں ایک انوکھے تجربے کا اضافہ کیا۔ وطن عزیز میں اُس وقت کتابوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ لوگوں کو پڑھنے کا شوق تھا۔ مگر کتابیں اُن کی دسترس سے باہر تھیں۔ ایسے میں سیّد قاسم محمود نے مکتبہ شاہکار کے نام سے اپنا ایک اشاعتی ادارہ لاہور میں قائم کیا اور رسالے کی شکل وصورت میں ارزاں اور وافر کتابیں ''شاہکار جریدی کتب'' کے نام سے شائع کرنا شروع کیں۔ دنیا بھر میں یہ ایک منفرد تجربہ تھا اور اس کی داد بھی انہیں دنیا بھر کے شائقین کتب نے دی۔ شاہکار کتب کی اس سیریز میں اُردو ادب کی اور عالمی ادب کی مشہور و معروف اعلیٰ کتابوں کو شائع کیا گیا۔ ان کی

قیمتیں انتہائی کم رکھی گئیں اور سو روپے کی کتاب تشنگانِ علم کو دو روپے میں دستیاب ہوئی۔ پھر یہ بھی ہوا کہ پہلی بار کتاب عام آدمی کے ہاتھوں میں پہنچی۔ بڑے بڑے کتب خانوں کی بجائے ایک عام ہاکر کے ہاتھوں مختلف بک سٹالوں پر نظر آئی۔ یہ اشاعت کتب کے میدان میں اوّلین تجربہ تھا۔ پاکستان کے بڑے بڑے ناشرین اس کی پیروی پر مجبور ہوئے۔ جریدی کتب کی اشاعت سے کتابوں کی قیمتیں کئی گنا کم ہوگئیں اور اس طرح سے کم آمدنی والے گھرانے بھی علم وادب کی روشنی سے منور ہوگئے۔ جریدی کتب کے ساتھ ساتھ سید قاسم محمود صاحب نے انسائیکلوپیڈیا ''معلومات'' دوبارہ شروع کیا جو مکمل نہ ہوسکا۔ بے بی انسائیکلوپیڈیا کے نام سے بچوں کے لیے ایک انتہائی خوب صورت رنگین انسائیکلوپیڈیا قسط وار شائع ہوا۔ یہ بھی ادھورا رہا۔ شاہکار ''اسلامی انسائیکلوپیڈیا'' کے نام سے 36 اقساط میں عظیم الشان اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت مکمل ہوئی جو بعد میں یک جلدی بھی شائع ہوا۔ شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا خدمت اسلام کی ایک عاجزانہ اور منظم کاوش تھی۔ عوامی بنیاد پر اُردو کا پہلا ہمہ گیر، جامع اور ہر لحاظ سے مکمل انسائیکلوپیڈیا تھا جس میں اسلام اور اسلامیات کے ہر موضوع کا احاطہ کیا گیا۔ جریدی کتب کے ساتھ ساتھ مکتبہ شاہکار نے اخباری کتب، ڈائجسٹ کتب، جیبی کتب اور پیپر بیکس بھی شائع کیں۔ اُردو ادب کی عظیم کلاسیکی کتاب ''طلسم ہوشربا'' کو بھی ڈائجسٹ سائز میں شائع کرنے کا پروگرام تھا۔ مگر اس کی صرف 21 اقساط شائع ہوسکیں۔ پندرہ روزہ رسالہ ''قافلہ'' بھی شاہکار کی جانب سے شائع ہونا شروع ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرے مطالعے کے شوق کو پروان چڑھانے میں شاہکار ادبی تحریک کا بہت بڑا حصہ ہے۔ علم حاصل کرنے کا شوق تو مجھے بچپن سے ہی تھا اور میں کورس کی کتابیں پڑھنے کی بجائے دیگر ادبی کتب پڑھنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ مگر میرے اس شوق کو مہمیز شاہکار ادبی تحریک نے دی۔ میں یہاں یہ بھی بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ شاہکار مطبوعات میں سیّد قاسم محمود صاحب کے اداریے بھی مجھے بہت اچھے لگتے تھے اور ذہنی طور پر میں ان سے ازحد متاثر ہوتا تھا۔ مجھے فخر ہے کہ کتاب کو خرید کر پڑھنے اور اُسے حفاظت سے سنبھال کر رکھنے کا شوق بھی مجھے انہی کتابوں نے دیا۔ شاہکار کتابوں نے مجھے دیگر تمام قسم کی کتابوں کے مطالعے سے بے نیاز کردیا۔ اس لیے کہ اس سیریز میں ہر موضوع کی کتابیں شائع ہوئی تھیں۔

سیّد قاسم محمود صاحب کی تحریریں پڑھ پڑھ کر اُن کی ایک تصویر سی بنتی گئی۔ کئی بار لاہور جانا ہوا مگر شومئی قسمت اُن سے ملاقات کی حسرت دل ہی دل میں رہی۔ میں انہیں خطوط ارسال کرتا رہا مگر یہ خط کتابت یک طرفہ تھی۔ اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے قاسم صاحب جواب نہ دے سکتے تھے۔ ہاں ان کے ادارے کے کارکن ساتھیوں کی جانب سے جواب موصول ہوجاتا تھا۔ 1978ء سے قاسم محمود صاحب نے پندرہ روزہ ''قافلہ'' کا اجراء کیا تھا۔ ابتدا میں تو یہ صرف ایک ادبی رسالہ تھا مگر 1979ء میں جب مارشل لاء حکومت نے قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کو بے گناہ پھانسی پر چڑھادیا تو سید قاسم محمود نے ''قافلہ'' کا رخ سیاسی صحافت کی طرف موڑ دیا۔ انہوں نے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کی کھل کر مخالفت کی۔ قافلہ کی تحریروں نے مارشل لاء کے خلاف ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ مرحوم ستار طاہر اللہ انہیں غریق رحمت کرے جو سیارہ ڈائجسٹ میں بھی قاسم محمود صاحب کے شریک کار رہے تھے۔ انہوں نے بھی قاسم محمود صاحب کی ہمراہی میں مارشل

لاء حکومت کے خلاف انتہائی اعلیٰ تحریریں لکھیں۔ ''مردہ بھٹو، زندہ بھٹو'' جیسی فکر انگیز تحریر اور ''سورج بکف شب گزیدہ'' جیسا امر ناول ''قافلہ'' کے ذریعے ہی قارئین کے سامنے آیا۔ یہ وہ دور تھا جب ذہنوں پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ حق بات لکھنا تو درکنار سوچنا تک گناہ تھا۔ مارشل لاء کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اس دور میں بھی صرف چند سر پھرے تھے جنہیں قلم کی عصمت کا خیال تھا جو حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا جانتے تھے۔ اس دور میں جن ادیبوں اور دانشوروں نے بحالی جمہوریت کے لیے قلم سے جہاد کیا ان میں سیّد قاسم محمود بھی شامل تھے۔ قافلہ کی اس دور کی فائل گواہ ہے کہ ویسی تحریریں اُس وقت پورے پاکستان میں کہیں نہیں لکھی گئیں۔ آج جمہوریت کے چمپئن تو کئی لوگ بن رہے ہیں مگر شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ قاسم محمود صاحب کی خدمات بہت سے دوسرے لوگوں سے زیادہ ہیں۔ ع مگر منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے..... قافلہ کی اُس دور کی تحریروں نے مجھے قاسم محمود صاحب کے ذہنی طور پر اور قریب کر دیا۔ پھر وہی ہوا نازک مزاج شاہاں برہم ہوا اور قاسم محمود صاحب زیر عتاب آ گئے۔ رسالہ قافلہ بند ہوا۔ طلسم ہوشربا اور دوسرے اشاعتی سلسلے موقوف ہو گئے۔ مختلف تھانوں میں جھوٹے مقدمات بنائے گئے اور یوں اگست 1980 میں سیّد قاسم محمود کو اپنے ہی ملک میں لاہور سے کراچی ہجرتِ ثانی پر مجبور ہونا پڑا۔ میں سیّد قاسم محمود کو ضیائی مارشل لاء کا پہلا مہاجر ادیب کہوں گا۔ ایک ایسا سچا اور کھرا ادیب جس کی تحریروں نے ایوانِ حکومت میں کھلبلی مچا دی اور جس پر لاہور میں رہنا دشوار بنا دیا گیا۔ طاقت کے نشے میں چور حکمرانوں نے شاہ جی کو لاہور سے تو دور کر دیا مگر شاہ جی کو قلم سے دور نہ کر سکے۔ شاہ جی کراچی آ گئے اور ''عالمی ڈائجسٹ'' کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

میں شاہ جی کے بارے میں انتہائی فکر مند تھا۔ کیونکہ ایک تو وہ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں کراچی گئے تھے۔ دوسرا کتابوں کے حوالے سے اُن سے جو تعلق قائم ہوا تھا اُس میں رخنہ پڑ گیا تھا۔ آخر ایک روز کراچی سے شائع ہونے والے ایک ماہنامہ ''دیپک'' میں مجھے ان کا نام نظر آیا۔ انتہائی مسرت ہوئی اور میں نے اُسی رسالے کی معرفت اُن کو خط لکھ دیا۔ چند دنوں کے بعد ان کا 5 اگست 1981ء کا لکھا ہوا گرامی نامہ مجھے موصول ہوا۔ یہ ان کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا میری جانب پہلا خط تھا۔ اس میں انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کراچی میں مکتبہ شاہکار کا از سر نو قیام کر لیا ہے اور پیپر بیک کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ گویا قفس اپنی ہی راکھ سے دوبارہ زندہ ہو چکا تھا۔ اب پھر میرا شاہکار کتب کے ساتھ رابطہ بحال ہو چکا تھا۔ پیپر بیکس کی صورت میں ارزاں قیمتوں میں معیاری کتابیں پھر چھپ رہی تھیں اور طالبانِ علم کی پیاس بجھا رہی تھیں۔ میری خط و کتابت بھی شاہ جی کے ساتھ جاری تھی۔ 1983ء میں قاسم محمود صاحب نے مکتبہ شاہکار کو شاہکار بک فاؤنڈیشن کا نام دے کر یک جلدی ''اسلامی انسائیکلو پیڈیا'' انتہائی خوبصورت انداز میں شائع کیا۔ میں نے انہیں تعریفی خط لکھا اور انسائیکلو پیڈیا کے بارے میں اپنے رائے بھی۔ قاسم محمود صاحب نے پہلے ایڈیشن کے بعد شائع ہونے والے ایڈیشنوں میں ''شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا'' ہماری نظر کے عنوان سے میری رائے بھی شائع کی۔ آج بھی جب میں کہیں

اسلامی انسائیکلو پیڈیا دیکھتا ہوں اور مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، جناب رئیس امروہوی (مرحوم)، جناب راجہ محمد ظفر الحق، جناب مولانا کوثر نیازی (مرحوم)، ڈاکٹر محمد افضل، جناب جمیل الدین عالی، ڈاکٹر انعام اللہ خان، ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب میرزا ادیب مرحوم، جناب مجیب الرحمٰن شامی، جناب ایس اے علوی اور جناب بشیر ساجد جیسے مشاہیر کے ساتھ اپنا نام دیکھتا ہوں تو عجیب فخر وانبساط کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یہ سب شاہ جی کی محبت نوازی ہے۔ قاسم محمود صاحب کی تحریروں نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور اب دل میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ اب اُن سے بالمشافہ ملاقات ہونی چاہیے۔ کراچی جانے کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ میں دفتری کاموں کے دھندے میں اس قدر پھنسا ہوا تھا کہ چھٹی ملنا بھی محال تھا۔ ستمبر 1984ء میں ایک جذباتی فیصلے کے نتیجے میں میں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ گو بعد میں صرف تین ماہ کے بعد اُسی ادارے میں دوبارہ ملازمت اختیار کی۔ مگر تقریباً تین ماہ میں مکمل آزاد رہا۔ انہیں ایام میں میری سید قاسم محمود صاحب سے ملنے کی دیرینہ آرزو بھی پوری ہوگئی۔ ہوا یوں کہ میرے ایک دوست کے چھوٹے بھائی کی شادی کراچی میں ہونا قرار پائی۔ بارات نے ملتان سے جانا تھا۔ شادی کا دعوت نامہ پا کر مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہو رہی تھی کہ سید قاسم محمود صاحب سے ملاقات کا نادر موقعہ ہاتھ آ رہا تھا۔ 11 نومبر 1984 کو میں بارات کے ساتھ عازمِ کراچی ہوا۔ کراچی جاتے ہی سب سے پہلے ذہن میں یہی تھا کہ ہر حال میں قاسم صاحب سے ملاقات کرنا ہے۔ شادی والے گھر کی رونقیں عروج پر تھیں اور میں چپکے سے ایک دوست کو لے کر 13 نومبر کو علی الصبح گھر سے نکل گیا۔ ہماری منزل شاہکار بک فاؤنڈیشن کا دفتر تھا جو کہ حسن علی آفندی روڈ پر واقع تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ شاہ جی آج دفتر نہیں آئیں گے۔ بلکہ گھر پر مل سکتے ہیں۔ وہاں سے ان کے ایک شریک کار کے ہمراہ ہم شمالی کراچی پہنچے۔ میں نے اپنے ذہن میں اُن کی جو تصویر بنائی ہوئی تھی بہ وقت ملاقات میں نے انہیں بالکل ویسا ہی پایا۔

جب ہم ان کے پاس پہنچے تو یہ اُس وقت لکھنے میں مصروف تھے۔ ہم سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد لکھنے سے فارغ ہوئے تو میں نے کہا جناب میں ملتان سے آیا ہوں اور میرا نام..... انہوں نے کہا جی مجھے معلوم ہے آپ مظہر سلیم ہیں۔ کیونکہ جب آپ نے کہا کہ میں ملتان سے آیا ہوں تو مجھے یقین تھا کہ وہاں سے صرف آپ ہی مجھے ملنے آ سکتے ہیں۔ وہاں سے وہ ہمیں اندر اپنے ریڈنگ روم میں لے آئے جہاں بے شمار کتابیں سلیقے سے شیلفوں میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی اپنائیت سے پیش آئے اور بڑی دیر تک محبت سے باتیں کرتے رہے۔ کتابوں کی باتیں، تعلیم کی باتیں، علم کی باتیں، اُن کے پاس بیٹھ کر مجھے یہ احساس ہو رہا تھا جیسے ہم نہ جانے کتنے برسوں سے ایک دوسرے سے آشنا ہیں۔ یہ پہلی ملاقات محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ انہوں نے چائے وغیرہ سے ہماری خاطر تواضع کی۔ میں نے اجازت چاہی تو کہا کہ نہیں آپ کھانا کھا کر جائیں گے۔ مگر مجھے علم تھا کہ صبح ہی بارات نے واپس جانا ہے اس لیے میرا وہاں بروقت پہنچنا ضروری تھا۔ دل تو میرا یہی چاہتا تھا کہ اُن کے پاس بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہوں۔ مگر وقت کی کمی سدِ راہ تھی۔ ان سے اجازت لی۔ انہوں نے اپنے ادارے کی جانب سے چھپی ہوئی ایک کتاب مجھے ہدیہ کی۔ یہ قیوم راہی کے افسانوں کا مجموعہ تھا۔ ''مسکراتا ہوا شخص'' اُس پر

انہوں نے تحریر کیا ''مظہر سلیم مجوکہ کے لیے پیار کے ساتھ، بہ وقت ملاقات سیّد قاسم محمود ۱۳ نومبر ۱۹۸۴ء۔ ہمیں الوداع کرنے باہر تک آئے اور گھر سے کافی دور تک بس سٹاپ تک ہمارے ساتھ چلتے آئے۔ میں نے جدا ہوتے وقت ان سے معانقہ کیا تو میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ یہ ان سے جدا ہونے کا ملال تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں بھی مجھے نمی محسوس ہوئی۔ ان کی آنکھوں میں مجھے بلا کی مقناطیسی کشش بھی نظر آئی۔ شاید یہ ان کی شخصیت کا سحر تھا جو اُن کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ میں اُس وقت گرفتہ دل ان سے جدا ہوا مگر تا زندگی اُن کی شخصیت کے سحر سے نہیں نکل سکا۔ پہلی ملاقات کا جادو آج تک برقرار ہے اور میں اس طلسم سے مرتے دم تک رہا نہیں ہونا چاہتا۔ وہاں سے میں اپنے دوست کے ہمراہ حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے مقبرے پر سلام کرنے گیا اور وہاں سے واپس شادی کی تقریب میں شامل ہو گیا۔ دوسرے روز ہم واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس دن کے بعد میرا ایک عرصہ تک کراچی جانا نہیں ہوا۔ (اکتوبر 2013ء کو کراچی جانا ہوا۔) اُس سفر میں بھی میں نے صرف قائداعظم کے مقبرے پر سلامی دی تھی اور قاسم محمود صاحب سے ملاقات کی تھی۔ اس کے سوا کراچی کی کوئی سیر نہیں کی۔ مگر مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میرا یہ سفر رائیگاں نہیں تھا۔ جن دو شخصیات سے میں متاثر ہوں ان دونوں سے شرفِ ملاقات میں نے حاصل کر لیا۔ کراچی کا جب تصور ذہن میں آتا تو ان دو شخصیات کا حوالہ میرے سامنے ہوتا۔ ان دونوں کے علاوہ کراچی میں میرا اور کون تھا۔

آج بھی جب قاسم صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کی یاد تازہ کرنا ہو تو میں الماری سے اُن کی ہدیہ کی ہوئی کتاب نکال کر ورق گردانی شروع کر دیتا ہوں۔

قیوم راہی کے افسانے ''مسکراتا ہوا شخص'' پیار کے ساتھ۔ ۱۳ نومبر ۱۹۸۴ء میرے لیے یادگار دن۔

اس کے بعد بھی شاہ جی سے خط کتابت جاری رہی۔ 1985 میں سیّد قاسم محمود نے ماہنامہ ''طالب علم'' کا اجراء کیا جس کا نام بعد میں ''سائنس میگزین'' رکھ دیا گیا۔ یہ جریدہ دسمبر 1994 میں اپنی اشاعت کے دس سال مکمل کر چکا تھا۔ وطن عزیز میں سائنس کے موضوع پر شائع ہونے والے رسالوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ سائنس میگزین اُن میں سرفہرست تھا۔ اس کے یادگاری نمبر، جاپانی سائنس نمبر، آئن سٹائن نمبر، طیارہ نمبر، ایٹم بم نمبر، ایڈز نمبر، جنگ خلیج نمبر اور تاریخ نمبر حوالے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ سائنس انسائیکلوپیڈیا کے نام سے ''فلکیات'' اور ایجادات کے موضوع پر دو جلدیں چھپ چکی ہیں۔ 1985ء میں انہوں نے عالم اسلام کے حالات پر ایک جامع اور باتصویر ''اسلامی الممالک'' بھی شائع کیا۔

ستمبر 1988ء سے آپ نے افسانوی ادب کی اشاعت کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ اس کے تحت ''افسانہ ڈائجسٹ'' کے عنوان سے اپریل 1992ء تک 19 شمارے شائع ہوئے جن میں دنیا کے بہترین افسانوں کا ایک انتخاب شائع کیا گیا۔ جنوری انیس سو نواسی 1989 سے ''انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا'' قسط وار سلسلہ شروع کیا۔ ماہنامہ مطالعۂ پاکستان کا اجراء کیا۔ اسلامی ڈائجسٹ کا اجراء کیا۔ ''علم القرآن''

کے عنوان سے 30 پارے الگ الگ شائع کیے۔ عربی متن بمعہ اُردو اور انگریزی ترجمہ اور تفاسیر کا انتخاب۔ علم الحدیث کے عنوان سے صحیح بخاری کی تدوین نو کا کام کیا۔ عربی متن اور اردو انگریزی ترجمے کے ساتھ۔ سید قاسم محمود صاحب کی محبت ہے کہ وہ جب بھی ملتان تشریف لائے ان کا قیام میرے ہی غریب خانے پر ہوا۔ میرے ہاں وہ سب سے پہلے 28 مارچ 1987ء کو تشریف لائے۔ 29 مارچ 1987ء کو ہم نے ان کے اعزاز میں ایک خوبصورت تقریب کا اہتمام ایک مقامی ہوٹل میں کیا تھا جس میں ملتان کے تمام سرکردہ ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی اور قاسم محمود صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر عرش صدیقی مرحوم، ڈاکٹر اے بی اشرف، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر محمد امین، حیدر گردیزی مرحوم، نسیم شاہد، منظر علوی، پروفیسر حسین سحر، ڈاکٹر ارشد ملتانی مرحوم، مبارک مجوکہ، اظہر مجوکہ، شاکر حسین شاکر، جاوید اختر بھٹی اور صلاح الدین حیدر اس تقریب میں موجود تھے۔ محترم عبداللطیف اختر نے 20 اپریل 1987ء کے روزنامہ نوائے وقت کے ادبی کالم "حکایت دل" میں اس تقریب کا احوال لکھا۔ بعد میں قاسم محمود صاحب نے کراچی واپسی پر اس سفر کا تفصیلی حال اپنے ماہنامہ "طالب علم" میں بیان کیا۔ اس کے بعد بارہا شاہ جی کا آنا ملتان ہوا اور اس طرح سے مجھے انہیں انتہائی قریب سے دیکھنے اور کھل کر ان سے باتیں کرنے کے مواقع میسر آتے رہے۔ میری کوشش ہمیشہ یہ رہتی کہ جتنے دن وہ میرے ہاں قیام پذیر رہیں میں زیادہ سے زیادہ وقت اُن کے ساتھ گزاروں۔ وہ مجھے اپنے نئے اشاعتی منصوبوں سے آگاہ کرتے اور ہم دونوں مل کر ان اشاعتی منصوبوں کی کامیابی کے امکانات پر گفتگو کرتے۔ مجھے فخر ہے کہ ان کے کئی کامیاب اشاعتی منصوبوں کا پروگرام میرے غریب خانے پر ہی بنا۔

سیّد قاسم محمود کی شخصیت انتہائی سیمابی تھی۔ وہ وطن عزیز کے سچے شیدائی تھے۔ قائداعظم اور پاکستان سے اُن کی محبت انمٹ تھی۔ اپنی دُھن کے پکے، جہالت کے خلاف جہاد کا جو نعرہ انہوں نے بلند کیا تھا اُس پر کامیابی سے ڈٹے رہے۔ پاکستان میں اور کوئی بھی ادیب ایسا نہیں ہے جو نت نئے منصوبے بنائے اور بحیثیت ناشر اُن پر عمل بھی کرے۔ انہوں نے ایسے ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالا جو کام بڑے بڑے ادارے یا حکومتوں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ وسائل کی کمی نے ہمیشہ اُن کا راستہ روکا لیکن انہوں نے کبھی بھی کسی مشکل کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ملکی حالات کے بارے میں بھی وہ ہمیشہ متفکر رہتے تھے۔ کئی بار مجھ سے گفتگو میں کہا کہ قیامِ پاکستان کے بعد کی کم از کم تین نسلوں کو ہم ضائع کر چکے ہیں۔ اب اگر مجھے کسی پر بھروسہ ہے تو وہ نئی نسل ہے۔ یہ بچے جو ہمارا مستقبل ہیں۔ اگر ان کی اچھی پرورش کی جائے اور ان کے لیے اچھا علمی اور فکری ماحول پیدا کیا جائے تو ان میں صحیح قائدانہ صلاحیتیں بیدار ہو سکیں گی۔

سیّد قاسم محمود کسی بھی قسم کے صلے اور ستائش کی تمنا نہیں رکھتے تھے۔ بس کام کیے جاتے تھے اور اس کا اجر انہوں نے اللہ پر چھوڑ رکھا تھا۔ علم کے چراغ انہی جیسے لوگوں کے دم سے فروزاں ہیں۔ سیّد قاسم محمود اپنی ذات میں ایک مکمل ادارہ تھے۔ ادبی میدان میں ان کے کارنامے تادیر زندہ رہیں گے۔ زندہ قومیں ایسے نابغہ عصر لوگوں کو انعامات و اکرامات سے نوازتی ہیں۔ حکومتیں ایسے عظیم لوگوں کو عزت و مرتبہ دیتی ہیں مگر افسوس ہمارے ہاں ایسی روایات زندہ نہیں رہیں۔ اب انعامات حاصل کرنے کے لیے دیگر لوازمات ہیں۔ وہ لوگ جو

گوشہ نشین ہیں اور خاموشی سے علم و ادب کی خدمت کیے جا رہے ہیں اُن کی عزت افزائی ضروری ہے۔ مگر پی آر شپ کے بغیر آج اس کا تصور بھی محال ہے۔

سیّد قاسم محمود ساٹھ کی دہائی کے ایک مشہور افسانہ نگار بھی تھے۔ 1970ء تک وہ باقاعدگی سے افسانے لکھتے رہے۔ میں نے اُن کے قریباً سارے ہی افسانے پڑھے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار ہماری جیتی جاگتی زندگی کے زندہ کردار ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر بیانیہ افسانے لکھتے ہیں جن کے کرداروں میں نیکی اور بدی کی علامتیں نمایاں ہیں۔ ان کے تاثراتی افسانوں میں مجھے ذاتی طور پر اور..... اور..... اور..... موت کی خوشبو، ''سانولی'' اور ''قاسم کی مہندی'' بہت پسند ہیں۔ ان کے بعض افسانوں کی ایک نمایاں خوبی اُن کی پاکستانیت ہے۔ ایسے افسانوں میں مجھے ضمیر کی آواز، نوکر شاہی، طبعی موت اور رستم خان انتہائی پسند ہیں۔ قائداعظم کی رحلت پر اُن کا ایک پر درد مضمون ''گیارہ ستمبر کی رات'' مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

قاسم محمود صاحب کے تراجم بھی میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھے ہیں۔ اُن کو فن ترجمہ پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اُن کا ترجمہ رواں اور شستہ ہوتا ہے۔ شیکسپیئر کے چند ڈراموں کا انہوں نے نہایت کامیابی سے ترجمہ کیا ہے۔ بحیثیت مدیر اور ناشر قاسم محمود صاحب نے اتنا کام کیا ہے کہ وہ افسانے کو وقت نہیں دے سکے۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ اگر گردشِ ایام انہیں فرصت دیتی تو وہ افسانہ لکھنا کبھی نہ چھوڑتے وہ کہتے کہ ''اگر مجھے فرصت مل جائے تو میرے پاس بے شمار افسانوں کے پلاٹ موجود ہیں۔ کئی کہانیاں مجھ سے اپنا آپ لکھوانا چاہتی ہیں کئی کردار ہیں جو میرے افسانوں میں امر ہونا چاہتے ہیں مگر وائے افسوس کہ غم روزگار کے آگے میں بے بس ہوں۔

تصنیف و تالیف اُن کے لیے کل وقتی کام تھا۔ حالانکہ وہ عمر کے جس مرحلے پر تھے وہاں تو لازم تھا کہ وہ بجائے ناشر کے صرف بحیثیت ادیب اپنا فرض ادا کرتے۔ ناشر اور مدیر کی حیثیت نے ان کے اندر کے ادیب کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان کے قاری ان کی نئی تخلیقات پڑھنا چاہتے تھے۔ ملتان میں سیّد قاسم محمود کے ساتھ منائی جانے والی دو اور تقاریب کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ 5 ستمبر 1993 کو ایک مقامی ہوٹل میں برادرم اظہر سلیم مجوکہ کی ادبی تنظیم ''رابطہ'' کے زیر اہتمام قاسم صاحب کے ساتھ ایک تقریب منائی گئی۔ اس تقریب کی صدارت جناب طاہر تونسوی نے کی۔ جبکہ عرش صدیقی مرحوم اور حسین سحر مہمانانِ خصوصی تھے۔ اس تقریب میں سید قاسم محمود نے اپنا افسانہ ''عشق حقیقی'' پیش کیا جسے حاضرین نے از حد پسند کیا۔ قاسم صاحب کے افسانہ سنانے کے انداز کو بھی بے حد سراہا گیا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے صدارتی خطاب میں بہت اچھی بات کی کہ سید قاسم محمود کا ادبی مقام اور ادبی حوالہ بہت معتبر ہے لیکن افسوس کہ ناقدین ادب نے اُن کا ذکر کرنے میں کسر نفسی سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر عرش صدیقی مرحوم نے کہا کہ اُردو ادب کو سیّد قاسم محمود جیسے افسانہ نگار کی ضرورت ہے۔ کیونکہ قاسم محمود سچے جذبوں اور ضمیر کی آواز کے مطابق افسانہ لکھتے ہیں۔ پروفیسر حسین سحر نے کہا کہ قاسم محمود کے اشاعتی ادارے نے بہت سے قاری پیدا کیے ہیں۔ انہوں نے توقع ظاہر کی تھی کہ سیّد قاسم محمود علم و ادب کے لیے آئندہ بھی اسی سرگرمی

Scanned with CamScanner

سے اپنا کام جاری رکھیں گے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے فرمایا کہ سید قاسم محمود نے اپنے علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے اپنا ایک اہم مقام بنایا ہے اور اُردو افسانے کو ان جیسے بے باک افسانہ نگار کی ضرورت ہے۔ تقریب سے اقبال ارشد، علمدار حسین بخاری، شفیق آصف اور شاکر حسین شاکر نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ اس تقریب میں علم و ادب سے تعلق رکھنے والے نمائندہ افراد نے شرکت کی۔ اس تقریب کا حال برادرم اظہر سلیم مجوکہ نے ماہنامہ جلترنگ ملتان شمارہ اکتوبر 1993 میں اپنے کالم ملتانِ ما میں تفصیل سے کیا۔

ایک صحافیانہ سروے کے مطابق پاکستان کے ''دس بڑے مدیروں'' کے لیے ایک جائزہ مرتب کیا گیا۔ اس میں قاسم محمود صاحب کا نام شامل تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے ایک طالب علم اپنے ایک مقالے کے لیے ''قاسم محمود بطور مدیر'' پر تحقیق کر چکے ہیں۔ اس سے پہلے کراچی یونیورسٹی کے ایک طالب علم ''قاسم محمود کے اداریے'' ایم اے کا مقالہ پیش کر چکے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں سیّد احتشام حسین، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم، سیّد عابد علی عابد مرحوم، ڈاکٹر وزیر آغا مرحوم، مولانا صلاح الدین احمد، سید سبط حسن، انور سدید، احمد ندیم قاسمی مرحوم اور ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم جیسے جید نقادانِ فن نے نوٹس لیا۔ ملتان کی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کو اس بات کی اوّلیت حاصل ہے کہ اُس کی طالبہ نگہت جمال نے اپنی استاد محترمہ روبینہ ترین کی نگرانی میں ''قاسم محمود کی افسانہ نگاری'' پر ایم اے اردو کا مقالہ لکھا۔ یہ سب شعبہ اُردو (کے اس وقت) کے سربراہ ہر دلعزیز استاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر انوار احمد صاحب کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ڈاکٹر انوار احمد صاحب کی افسانہ نگاری سے محبت سب پر عیاں ہے۔ 31 مارچ 1994ء کو بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ اُردو کے زیر اہتمام سیّد قاسم محمود صاحب کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تقریب کی صدارت محترم ڈاکٹر انوار احمد صاحب نے کی اور اس میں طلباء اور طالبات کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ قاسم محمود صاحب نے اس تقریب میں اپنا افسانہ ''رستم خان'' سنایا۔ افسانے کو از حد پسند کیا گیا۔ بعد میں افسانے اور صاحب افسانہ کے حوالے سے طلباء اور طالبات نے کئی سوالات کیے۔ یہ ایک بھرپور تقریب تھی اور اس حوالے سے اس تقریب کی اہمیت دوچند ہو گئی تھی کہ صاحب افسانہ پر یونیورسٹی میں مقالہ بھی لکھا جا رہا تھا۔ تقریب میں ڈاکٹر انوار صاحب نے صاحب افسانہ کے بارے میں تعارفی کلمات کہے اور قاسم صاحب کی افسانہ نگاری کی تعریف کی۔ قاسم محمود صاحب کے ایک ادنیٰ عقیدت مند کی حیثیت سے میری صرف ایک خواہش تھی کہ قاسم محمود صاحب اپنی خودنوشت ''دھوپ چھاؤں'' جلد از جلد مکمل کرتے۔ قاسم محمود صاحب پاکستان کے ساتھ ہی جوان ہوئے تھے، انہوں نے اپنی آنکھوں سے پاکستان کو بنتے اور بگڑتے دیکھا۔ ان کی ساری زندگی جہد مسلسل کی عملی تصویر تھی۔ انہوں نے عملی زندگی کے آغاز میں ہی پاکستان کے عظیم ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ ہجرت کا زمانہ انہوں نے دیکھا۔ نئی مملکت اُن کے سامنے معرضِ وجود میں آئی۔ ہماری عظیم روایات جس طرح شکست و ریخت کا شکار ہوئیں سب اُن پر روشن تھا۔ میں نے اس خودنوشت آپ بیتی کی ابتدائی اقساط طارق عزیز صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''پندرہویں صدی'' کے شمارہ اول جون 1982 سے دسمبر 1982 تک پڑھی تھیں۔

Scanned with CamScanner

سات اقساط کے بعد اس کی اشاعت کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ بعد میں ماہنامہ شاہکار میگزین میں چند اقساط شائع ہوئیں۔ اس بارے میں اکثر میری قاسم محمود صاحب سے بات ہوتی رہتی تھی۔ انہیں بھی اس آپ بیتی کی اہمیت کا احساس تھا۔ مگر ہر بار وہ طرح دے جاتے اور کہتے تھے کہ یہ آپ بیتی واقعی مجھ پر قرض ہے اور میں اسے ادا کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اسے ضبط تحریر میں لانا گویا زندگی کو نئے سرے سے بسر کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مجھے مکمل یکسوئی اور آرام حاصل ہو جائے۔ پھر میں اپنی یہ داستان اپنی قوم کو سناؤں گا۔ میں دعا گو رہا کہ خداوند کریم شاہ جی کی یہ خواہش پوری کرے اور ہم پاکستان کی کہانی قاسم محمود کی زبانی ''دھوپ چھاؤں'' کی صورت میں دیکھتے۔ مگر یہ آپ بیتی وہ لکھ نہ پائے۔

شاہکار ادبی تحریک کے بانی سیّد قاسم محمود کی عظمت کو سلام کرتے ہوئے صرف یہ کہوں گا کہ پاکستان میں اُردو کی ادبی تحریکیں تو ادیبوں کے لیے تھیں۔ مگر شاہکار ادبی تحریک واحد تحریک تھی جو ادب کے قاری کے لیے تھی۔ جب تک ادب کا قاری زندہ رہے یہ تحریک زندہ رہے گی۔

1997 میں سیّد صاحب کراچی سے لاہور واپس آ گئے۔ وہ اسے اپنی ہجرت ثالث قرار دیتے ہیں۔ یہاں سے دوبارہ انہوں نے اپنے اشاعتی پروگرام کو جاری کیا۔ لاہور آنے پر بھی شاہ صاحب سے میرا رابطہ برقرار رہا۔ ان کے گرامی نامے ملتے رہے۔ مکتوب نگاری میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ مختصر مگر پر اثر تحریریں آپ کا خاصہ تھیں۔ قاسم صاحب کی ادارتی سرگرمیوں اور افسانہ نگاری کے حوالے سے تو جامعات میں ایم اے کی سطح کے مقالے لکھے گئے ہیں۔ اگر ان کی مکتوب نگاری کے حوالے سے بھی کام کیا جائے۔ تو یہ بھی لاجواب ہوگا۔ ملتان میں ایک ادارے میں برسا برس تک محنت، لگن اور خلوص کے ساتھ ملازمت کرنے کے بعد جب 2000 کے آخر میں مجھے اور دیگر ساتھیوں کو گولڈن ہینڈ کی بجائے آئرن ہینڈ کے ذریعے بے روزگار کر دیا گیا تو شاہ جی کے مشورے سے میں بھی لاہور آ گیا اور اپنے شوق کو وسیلہ روزگار بناتے ہوئے ''بک فین'' سے ''بک مین'' بن گیا۔ سال 2001ء کو قوم نے سال قائد کے حوالے سے بابائے قوم کا 125 واں جشن ولادت منایا۔ میں نے سیّد صاحب کی عطیہ کی ہوئی کتاب ''اسلام اور قائداعظم'' عطش درانی صاحب اور جناب محمد حنیف شاہد صاحب کے شکریے کے ساتھ شائع کی۔ ازاں بعد شاہ صاحب کی عطیہ کردہ ایک اور کتاب ''زندہ قائداعظم'' از جناب منظور عباسی شائع کی۔ ان کتابوں کی فروخت کے دوران جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ خوف فساد خلق کی وجہ سے ناگفتہ ہیں۔ جہاں یہ سننا پڑے کہ قائداعظم پر کتاب کون پڑھتا ہے۔ قائداعظم کا اسلام سے کیا واسطہ جہاں لوگ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کے قائل ہی نہیں بلکہ کندھا مار کر آگے نکلنے اور گرانے کے قائل ہوں جہاں ''فکر و فن'' نہیں ''مکر و فن'' کا دور دورہ ہو۔ جہاں ایسے ادارے ہوں جو کسی دوسرے مکتب فکر کی کتابیں بھی اپنے مکتبہ پر رکھنے کے روادار نہ ہوں وہاں میرا اشاعت کتب کا کاروبار کیا چلتا۔ شاہ صاحب کی مرتب کردہ ''روح القرآن'' اور روح الحدیث بھی میں نے اپنے ادارے سے شائع کیں۔ تھوڑی بہت جمع پونجی کے ساتھ اشاعت کتب کا کام ایک پاکیزہ

Scanned with CamScanner

کام سمجھ کر شروع کیا تھا۔ ایک سال میں ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کام تھوڑے سرمائے سے نہیں ہو سکتا اور دوسرا یہاں لوگوں کی ڈیمانڈ جن کتابوں کے پڑھنے کی ہے انہیں شائع کرنا اپنے بس میں نہ تھا۔ سو شکست کھا کر لاہور سے واپس ملتان کی راہ لی اور وہاں جاتے ہی دل کے مرض نے حملہ کر دیا۔ اللہ پاک نے نئی زندگی دی۔ ایک سال تک بستر پر پڑے پڑے کتابیں اور شاہ صاحب کے حوصلہ افزا خطوط میرے مونس وغم خوار رہے۔ 2002 میں شاہ صاحب کے مشورے سے دوبارہ لاہور آیا اور بعد میں شاہکار تحریک کے تسلسل کے طور پر مئی 2004ء سے ماہنامہ بک ڈائجسٹ شائع کرنا شروع کیا۔ یہاں بھی شاہ جی کی محبتیں میرے ہم راہ رہیں۔ بک ڈائجسٹ میں میں نے شاہ جی کی شائع کردہ ایرچ سیگل کی لوسٹوری اور اولیور سٹوری بھی شائع کیں۔

24 جنوری 2009ء کا دن میرے لیے میری زندگی کا ایک انتہائی یادگار دن تھا۔ اقبال اکادمی پاکستان کے زیر اہتمام شاہ جی کے مرتب کردہ انسائیکلو پیڈیا قرآنیات کی رونمائی کی ایک تقریب ایوان اقبال لاہور میں منعقد کی گئی جس کا انتظام وانصرام ناظم اقبال اکادمی محمد سہیل عمر نے کیا تھا۔ اس کی خاص بات سیّد صاحب کی گزشتہ نصف صدی کے دوران شائع ہونے والی تصانیف وتالیفات کی نمائش تھی۔ اُس میں محترم پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم، جناب ظفر علی راجا اور اس خاکسار نے شاہ جی کے حوالے سے مضامین پڑھے۔ صدارتی خطبہ محترم پروفیسر خورشید احمد صاحب نے دیا۔ میں نے اس تقریب میں شاہ جی کو بہت خوش دیکھا۔ نمائش میں رکھی گئی کتابیں شائقین کی بڑی تعداد نے دیکھیں۔ شاہ صاحب کے ادارے سے شائع ہونے والی ہر کتاب یہاں موجود تھی۔ اس موقعے پر میں نے بک ڈائجسٹ کا خاص شمارہ ''سیّد قاسم محمود حیات وخدمات'' شائع کیا اور تقریب میں شامل شرکاء میں تقسیم کیا۔ اس شمارے میں شاہ جی کا مختصر حیات نامہ اور بہ حیثیت اداریہ نویس، بہ حیثیت ادیب، بہ حیثیت قاموس نگار، بہ حیثیت مصنف ومؤلف، بہ حیثیت مدیر بہ حیثیت مترجم، بہ حیثیت ناشر اور بہ حیثیت کارکن تحریک پاکستان شاہ جی کی خدمات کا ایک طائرانہ جائزہ پیش کیا گیا تھا۔

تقریب کے اختتام پر مجھے شاہ جی کا ادا کیا ہوا ایک جملہ یاد ہے کہنے لگے کہ تم نے شاید میری حیات وخدمات پر شمارے مرتب کر کے مجھے الوداعیہ دے دیا ہے۔ میں نے کہا شاہ صاحب اللہ پاک آپ کی عمر دراز فرمائے میں ادب کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے عقیدتوں کا ایک ہار پروکر اپنے محسن پر نچھاور کرنے کا آرزومند ہوں۔ یہ ایک ادبی پجاری کی ایک ادبی دیوتا کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی ایک عاجزانہ کاوش ہے۔ آپ کی کامیابیوں اور کامرانیوں سے ایک زمانہ آشنا ہے۔ مگر جو آپ کے ادبی مقام سے روشناس نہیں ہیں وہ بھی آپ کے کارہائے نمایاں پر ایک نظر ڈال کر ہمارے ہم نوا ہوں گے کہ

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

شاہ صاحب نے جب ٹیمپل روڈ لاہور کے مشہور میاں چیمبرز میں شاہکار کا آفس قائم کیا تو رہائش بھی آفس میں رکھ لی۔ میں نے ایک دن کہا شاہ جی میری خواہش ہے کہ چند دن آپ کے ساتھ آفس میں ہی گزاروں۔ کہنے لگے اچھا تو یوں کرو کسی بات پر گھر والوں

Scanned with CamScanner

سے ناراض ہو کر ایک بیگ میں چند جوڑے ڈال کر آ جاؤ اور یہیں لوٹ لگا لیا کرنا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور قریباً ایک ہفتہ ان کے ساتھ یادگار دن گزارے۔ گیس سلنڈر کا ایک چولہا آفس میں ہی رکھا ہوا تھا جہاں چائے اور دیگر کھانے پینے کی چیزیں تیار کرتے تھے۔ وہاں رہ کر میں نے اس قاسم محمود کو دیکھا جو اصل قاسم محمود تھا۔ آخر شب قریباً ڈھائی بجے بیدار ہو کر عبادت سے آغاز اور پھر اپنی لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتے تھے اور صبح ساڑھے سات بجے تک متواتر لکھتے رہتے تھے۔ خط انتہائی خوب صورت تھا جسے پڑھنے میں کسی کو دقت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے 2002ء میں داڑھی رکھ لی تھی۔ قاسم صاحب ہر روز بلاناغہ شیو کرتے تھے۔ مجھے کہتے تھے کہ تم نے یہ کیا داڑھی رکھی ہوئی ہے کہ حالانکہ میری طرح تمہارے آئیڈیل بھی علامہ اقبال اور قائداعظم ہیں جو بے ریش تھے۔ میں کہتا شاہ جی آپ سرسیّد کے بھی تو مداح ہیں۔ جب بعد میں انہوں نے خود بہت خوب صورت داڑھی رکھ لی تو میرے پوچھنے پر کہ شاہ جی اب یہ آپ نے کیا کیا؟ تو کہتے تھے کہ میاں تم، سرسیّد اور ڈاکٹر اسرار احمد جیت گئے۔ وہ مذہبی نہیں ادبی آدمی تھے۔ مگر آخری عمر میں جب انہوں نے سیرت النبیؐ کے حوالے سے کام شروع کیا تو مذہب سے لگاؤ بڑھ گیا اور قرآنیات پر کام کرتے ہوئے تو ان کی زندگی ہی بدل گئی۔

اسلام، پاکستان اور کتاب سے سچی محبت کرنے والے نامور ادیب، بے مثل محقق، دور اندیش دانشور، خوبصورت افسانہ نگار، لاجواب مدیر، باکمال مترجم اور عہد ساز ناشر۔ اپنی ذات میں ایک مکمل ادارہ تھے۔ پاکستان میں ڈائجسٹ صحافت کے بانیوں میں سے ایک، شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا اور پاکستانیکا جیسے حوالہ جاتی منصوبوں کو تن تنہا پایہ تکمیل تک پہنچانے والے۔ شاہکار جریدی کتب کی صورت میں وطن عزیز کی کتابی صفت میں ایک انقلاب برپا کرنے والی اس رول ماڈل ہستی نے تشنگانِ علم کے لیے وافر مقدار میں ہر زمانے کی ہر موضوع کی شاہکار کتابیں انتہائی ارزاں قیمتوں میں شائع کر کے ایک عالم سے اپنا لوہا منوایا۔ علم القرآن کے عنوان سے قرآن مجید کی پارہ وار اشاعت کی۔ سیرت انسائیکلو پیڈیا مکمل کیا۔ انسائیکلو پیڈیا مسلم انڈیا اور انسائیکلو پیڈیا احیائے اسلام جاری کیا اور جنوری 2009 سے انسائیکلو پیڈیا قرآنیات کی قسط وار اشاعت کا آغاز کیا۔ شاہکار سے وابستہ احباب میں سے ستار طاہر، مظفر محمد علی، انیس یعقوب، مصباح الایمان، سیف الدین حسام، عبدالستار چوہدری، صہیب مرغوب، سلیم انور عباسی، علیم احمد اور سید عرفان احمد نمایاں نام ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا پر کام کرنے والوں کے لیے ان کے دل میں بہت عزت تھی۔ زاہد حسین انجم اور عقیل عباس جعفری کا ذکر میرے ساتھ بہت احترام سے کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ پاک و ہند کا سب سے بڑا مدیر شکیل عادل زادہ ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد سے قرآنیات کے حوالے سے متاثر تھے۔ مختار مسعود بطور ادیب پسند تھے۔ حکیم محمد سعید شہید کے بڑے مداح تھے۔ مجھے فخر ہے کہ شاہکار کی شائع کردہ تمام کتب میرے پاس موجود ہیں۔ سینکڑوں خطوط جو انہوں نے میرے نام لکھے محفوظ ہیں۔ حالات نے اجازت دی تو حواشی کے ساتھ انہیں شائع کروں گا۔ 17 نومبر 1928 کو کھرکھودہ ضلع روہتک میں پیدا ہونے والا عظیم ادیب اور ناشر 31 مارچ 2010ء کو لاہور میں راہی ملک عدم ہوا اور جوہر ٹاؤن اقبال ایونیو قبرستان میں آسودہ خاک ہوا۔ ایک صاحب کمال جس نے تمام عمر قلم

Scanned with CamScanner

اور کتاب کے سائے میں بسر کی۔ بیسویں صدی میں پیدا ہونے والا اکیسویں صدی کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ اور اپنی روایات سے جڑا ہوا بھی تھا۔ مجھے تو ان سا کوئی اور نظر نہیں آیا۔ آپ کی نظر میں ہو تو بتایئے گا۔

اسلام، پاکستان اور کتاب سے سچی محبت کرنے والے سیّد قاسم محمود کو میں صحرائے ادب کا مؤذن قرار دیتا ہوں۔ جو "حی علی الکتاب" یعنی آؤ کتابوں کی طرف کی صدا لگاتا رہا۔ جس کا پیغام تھا کہ

آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے
ہم بدلتے ہیں رُخ ہواؤں کا

ان کی تمام اشاعتی زندگی اس شعر کی عکاس رہی:

ہم اپنا کام کرتے ہیں، نئی شمعیں جلاتے ہیں
ہوا کرتی ہے اپنا کام اور شمعیں بجھاتی ہے

سیّد قاسم محمود کی ادبی خدمات کے نام سے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے لیے شبنم نیاز نے ایم فل کی ڈگری کے لیے مقالہ لکھا اور سیّد قاسم محمود.....احوال و آثار" کے عنوان سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، شعبہ اُردو کے غلام عباس نے ایم فل کے لیے مقالہ تحریر کیا۔

گو سیّد قاسم محمود شاعر نہیں تھے۔ مگر مجھے یکم اپریل 1994ء کو ملتان میں دیے گئے ایک آٹوگراف میں انہوں نے غالب کا یہ شعر لکھا تھا:

لافِ دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

ان کے چند اور پسندیدہ اشعار:

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

تیز رکھنا سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

شاہ جی اپنے ایک عقیدت مند اور مداح کا سلام قبول کیجیے۔

ع رفتید ولیک نہ از دل ما

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

سید مشکور حسین یاد

غزل

ہم نے غائب کو غبار کیا
اپنے حاضر کو زور دار کیا
وہ سبھی ہم سے آ کے ملتے رہے
ہم نے جس جس کا انتظار کیا
جیب کو تار تار کیا کرتے
جان کو اپنی اپنی تار تار کیا
ہم نے عُشاق کو جو دی تعلیم
شہر کا شہر خوش شعار کیا
نقد کرنے دیا نہ کوئی کام
ہم نے جو کچھ کیا اُدھار کیا
ہم کہ تکرار سے نہ گھبرائے
کام اچھا تھا بار بار کیا
ہم وضاحت سے کام لیتے ہیں یادؔ
ہم نے کیا کچھ اختصار کیا

صفدر سلیم سیال

غزل

ہم نے اک عمر ترے خواب سنبھالے رکھے
یہ وظیفے سر گرداب سنبھالے رکھے
آزمائش کی گھڑی میں بھی بصد جاہ و جلال
اپنے اسلاف کے آداب سنبھالے رکھے
دل بے تاب کو ارزاں کبھی ہونے نہ دیا
ترے کوچے میں بھی اعصاب سنبھالے رکھے
حرف ناموس طلب پر کبھی آنے نہ دیا
سب تقاضے دلِ بے تاب سنبھالے رکھے
تری چاہت میں کئی بار ہوئے پاگل ہم
پھر ترے قرب کے آداب سنبھالے رکھے
دیدہ و دل سے یہ سمجھوتا ہوا بہرِ خلوص
ترے پہلو میں بھی کچھ خواب سنبھالے رکھے
جتنی افتاد پڑی شہر غزالاں میں سلیمؔ
وہ مراسم جو تھے نایاب سنبھالے رکھے

Scanned with CamScanner

شفیق سلیمی

غزل

دیدہ و دل اجاڑ تھے جتنے تھے غم پہاڑ تھے
شب بھی بہت طویل تھی ٹوٹے پڑے تھے حوصلے
نورِ مہ و نجوم سے خالی تھا آسمان بھی
ہم نے اتباع میں سارے دیئے بجھا دیئے
رختِ سفر میں کچھ نہ تھا دستِ ہنر میں کچھ نہ تھا
جیسے گئے تھے ویسے ہی لوٹے دیارِ غیر سے
خواب و خیال کا جہاں ٹکتا نہیں ہے آنکھ میں
آب و تراب سے اُدھر دشتِ سراب سے پرے
پیڑوں میں آگ کیا لگی جتنے درند تھے سبھی
اپنے کچھار چھوڑ کر سوئے بلاد چل پڑے
حشر بپا ہے شہر میں ڈوبے ہیں غیض و قہر میں
جانے ہیں کیسی لہر میں بپھرے ہوئے یہ من چلے
جو بھی ہوا بجا ہوا کچھ بھی نہیں بُرا ہوا
خوشیاں نہ مل سکیں مگر غم سے نجات پا گئے
لمبی اڑان کیا بھریں ہم بھی قفس کے پاس ہی
بیٹھے ہوئے ہیں خاک پر جیسے ہوں ہم بھی پَر کٹے
دشتِ خزاں کی زد پہ ہیں اپنے شفیق جسم و جاں
جھڑنے لگے ہیں دم بہ دم شاخوں سے گل بہار کے

ایزد عزیز

غزل

کبھی ہَوا، کبھی ابرِ رواں کے ساتھ چلوں
کہ سب مناظرِ فطرت سپردِ خامہ کروں
اتارُوں آنکھ میں حیرت کے اس تسلسل کو
مَیں شش جہات میں اُڑتا ہوا پرندہ ہوں
کپاس چنتی ہوئی لڑکیوں کی قسمت میں
لکھا ہے کس نے سلگتے ہوئے سمے کا فسوں
نہ جانے کس کے بدن سے سمٹ کے آیا ہے
ٹپک رہا ہے جو چلتی ہوئی مشین سے خوں
یہ پتھروں سے لڑھکتے ہوئے حسیں چشمے
جو فرقِ سنگدلاں پر بہیں تو پھر جانوں
وہ اپنے حسن کے پَرتو کی اوٹ میں ہے کہیں
مَیں جس کے نام کی تسبیح دھڑکنوں میں سنوں
اسی کی دین ہیں ایزدؔ یہ سب گلابِ غزل
مجھے ہے اذن کہ شاخِ خیال سے چُن لُوں

Scanned with CamScanner

آفتاب کاوش

غزل

اب کہیں بھی یہ کارواں ٹھہرے
گھر سے نکلے تو بے اماں ٹھہرے
کُنگ صدیاں گزرتی جاتی ہیں
بے زبانی تبھی زباں ٹھہرے
کون سی آگ ہے بجھانی انہیں
چاند رک جائے آسماں ٹھہرے
جانے کس سمت جا رہی ہے زمین
کس کو معلوم ہے کہاں ٹھہرے
ہم بھی کب خوش گمان تھے ان سے
لوگ جو ہم سے بدگماں ٹھہرے
دیر و کعبہ میں کیوں اُسے ڈھونڈیں
جب کوئی خود ہی لامکاں ٹھہرے
کام کیا خوب یہ کیا ہم نے
تیری آنکھوں کے رازداں ٹھہرے
کسی نے کاوشؔ پلٹ کے دیکھا ہے
یک بہ یک سات آسماں ٹھہرے

جاوید قاسم

غزل

کھلا جو فتاب فن درونِ فن شبِ الم
دیے سے توڑ لی گئی کرن کرن شبِ الم
کہاں کہاں لیے پھری تلاشِ خال و خد مجھے
جہانِ بے کنار میں بدن بدن شبِ الم
کسی کو کچھ خبر نہیں کسی کو کچھ پتہ نہیں
بدل بدل کے آ رہی ہے پیرہن شبِ الم
تری نگاہِ ناز سے بدن کے اس گداز سے
عجب نہیں کہ جل اٹھے کرن کرن شبِ الم
بجھے جو دل کے آئینے مرا جو پانی آنکھ کا
فضا میں پھیلتی گئی چمن چمن شبِ الم
بھڑک اٹھی جو لو ذرا خیالِ حسنِ یار کی
ہزار دیپ جل اٹھے سرِ سخن شبِ الم
جو اہتمامِ شب ہوا تو ساحلِ فرات پر
ہوئے تھے کیسے کیسے چاند خیمہ زن شبِ الم

Scanned with CamScanner

آقائے مظہر عباس چوہدری

غزل

غزل ایسی کہاں لکھی گئی ہے
کہ شعروں میں اذاں لکھی گئی ہے
جو خالق ہے مکاں اور لامکاں کی
وہ ہستی لا مکاں لکھی گئی ہے
یہ کائناتِ عالم تو عزیزو
یہ حرفِ کن فکاں لکھی گئی ہے
قلم سے لوح پر تقدیرِ عالم
بہ نورِ کاملاں لکھی گئی ہے
ہے دانش اوّلین مخلوق لیکن
بوجہ حاملاں لکھی گئی ہے
ہے منزل عرش پر نورِ خدا کی
سرِ رہ کہکشاں لکھی گئی ہے
بہت تھوڑی سی دوری رہ گئی تھی
مقابل دوکماں لکھی گئی ہے
وہ ہستی جس نے ہستی کو اُجالا
شفیعِ مذنباں لکھی گئی ہے
فلاح اور عمل سے ہم نے جانا
ولایت مہرباں لکھی گئی ہے
یہی ہے نعمتِ عظمیٰ کہ جس میں
نجاتِ انس و جاں لکھی گئی ہے
بڑی مشکل کشائی ہو رہی ہے
بیاضِ مومناں لکھی گئی ہے
نزولِ آیۂ بلغ سے پہلے
غدیرِ خم بھی ہاں لکھی گئی ہے
حیاتِ جاودانی کی سعادت
تولا ترجماں لکھی گئی ہے
شقاوت سے ہمارا کیا تعلق
برأت بے گماں لکھی گئی ہے
زباں کٹنے سے کب کٹتے ہیں جذبے
عجب رمز بیاں لکھی گئی ہے
محبت مر کے زندہ باد ٹھہری
فرازِ نخلِ جاں لکھی گئی ہے
نہاں خانوں سے میرا واسطہ کیا
مری عادت عیاں لکھی گئی ہے
نہیں آسان اب اس کو مٹانا
یہ دھرتی آسماں لکھی گئی ہے
یہ قولِ معرفت ہے یا خبر ہے
امیں جنت کی ماں لکھی گئی ہے
وہ جس کے پاؤں میں جنت رہی ہے☆
وہ جنت آشیاں لکھی گئی ہے
مری پلکوں سے آنسو یوں گرے ہیں
حدیثِ بے زباں لکھی گئی ہے
قلم کی روشنائی کی صداقت
محیطِ این و آں لکھی گئی ہے

☆تحقیق غروی سے معذرت

Scanned with CamScanner

نیاز صادق ثانی کے صدقے
مراد طالباں لکھی گئی ہے
مری ہم سَر مودّت کے سفر میں
شریکِ کارواں لکھی گئی ہے
علی روشان کی شعلہ بیانی
وقارِ عاشقاں لکھی گئی ہے
حسن کو جو محبت ہے عزا سے
ادائے شایگاں لکھی گئی ہے
مرے بابا نے جب مجھ کو دعا دی
وہ ساعت حرزِ جاں لکھی گئی ہے
یہ دو غزلہ و سہ غزلہ نہیں ہے
غزل اک دودماں لکھی گئی ہے
تکلم میں روانی اور تسلسل
عطائے سیداں لکھی گئی ہے
عجب شام غریباں کا سماں ہے
یہ شام غم دُھواں لکھی گئی ہے
"خیام نور" کے چلنے کی بابت
روایت "الاماں" لکھی گئی ہے
اَنی نیزے کی سَر میں جب لگی ہے
شبِ غم خوں چکاں لکھی گئی ہے
دریدہ ہے اگرچہ دامنِ دل
طبیعت شادماں لکھی گئی ہے
کہیں پر خیمہ زن ہے موسمِ گل
کہیں طاری خزاں لکھی گئی ہے
تعدد میں "بہ یزداں ہم عدد" ہی
سپاہِ کامراں لکھی گئی ہے

محافظ دھوپ میں ایسے جلے ہیں
شریعت سائباں لکھی گئی ہے
وہ حد سے بڑھنے لگتے ہیں ہمیشہ
یہ خوئے ظالماں لکھی گئی ہے
لہو سے جستجو سے، آبِ زر سے
حدیثِ دل براں لکھی گئی ہے
کبھی بیعت نہیں کرتے کسی کی
یہ رسم "خاندانؑ"☆ لکھی گئی ہے
ہمیں کیسے جھکائے گا زمانہ
یہ کوشش رایگاں لکھی گئی ہے
امانت رکھنے والے بے خبر ہیں
حکومت بے ایماں لکھی گئی ہے
مَیں خوشبو سونگھتا ہوں اس کلی کی
جو امیدِ جہاں لکھی گئی ہے
ہے غیبت میں بہ باطن مصلحت یہ
مشیّت پاسباں لکھی گئی ہے
محمدؐ سے محمد تک مسلسل
فلاحِ اُمتاں لکھی گئی ہے
برائے خادمانِ آلِ احمدؐ
حیاتِ جاوداں لکھی گئی ہے
بڑھاپا آرہا ہے مجھ پہ مظہر
مگر فطرت جواں لکھی گئی ہے

☆ خاندانِ اہل بیتؑ

Scanned with CamScanner

نقش برخاک

محمود احمد قاضی

لفٹ حسب معمول خراب تھی اور کئی دنوں سے اسے اتنی سیڑھیاں طے کر کے اُس بلڈنگ کے چوتھے فلور پر آنا پڑ رہا تھا۔ تیسرے فلور تک پہنچتے پہنچتے اُس کا سانس پھول گیا تھا اور اُسے تھوڑی دیر کے لیے یہاں کے اندھیرے میں رُک کر سانس بحال کرنا پڑا تھا کہ ادھر کا بلب بھی کچھ عرصے سے خراب چلا آ رہا تھا۔ چند لمحے یہاں رک کر وہ چوتھے فلور پر چلا آیا۔ جیب سے چابی نکال کر اُس نے اسے اپنے فلیٹ کے بیرونی دروازے کے تالے میں گمایا سہ پہر کو ہونے والی بارش کی وجہ سے لمبوترا صحن ابھی تک کہیں کہیں سے گیلا تھا۔ برآمدہ عبور کر کے اُس نے بڑے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر حبس تھا۔ اُس نے دروازے کے دائیں بائیں والی دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔ کمرے کی فضا میں تازگی کا ہلکا سا احساس جاگا۔ تاہم اس تازگی میں بھی مٹی کی باس موجود تھی۔ اُس نے فرش کی طرف دیکھا۔ وہ مٹی سے اَٹا پڑا تھا۔ چند دنوں سے وہ ست ہونے لگا تھا۔ اُسے گھر کے کسی کام میں دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے خود کو ہلکی سی سرزنش کی اور برآمدے کے کونے میں پڑی ایک بالشت بھر کی تقریباً ناکارہ ہوئی جھاڑو اُٹھا کر کمرے کی صفائی کرنے لگا۔ اس کام سے فراغت پا کر اُس نے لگے ہاتھوں واش روم اور اُس کی بیرونی دیوار کے ساتھ نصب شدہ واش بیسن کی صفائی بھی کر ڈالی۔ یہاں البتہ اُسے پانی استعمال کرنا پڑا تھا۔ واش بیسن کے اُوپر لگے آئینے کو بھی اُس نے خوف چمکا دیا۔ پھر اُس نے واش بیسن پر جھک کر دانتوں میں برش کیا۔ تبھی اُس کا نہانے کو جی چاہا۔ وہ واش روم میں گھس گیا اور نل کھول کر نیچے بیٹھ گیا۔ نہانے کے بعد اُسے فرصت کا احساس ہوا۔ کمرے میں پہنچ کر اُس نے چارپائی کا رُخ شمال جنوب کے بجائے مغرب سے مشرق کی طرف کر دیا۔ دونوں کرسیوں اور میز کی جگہ بھی بدل دی۔ تپائی کو اُس نے چارپائی کی بائیں طرف سے اُٹھا کر دائیں طرف کر دیا۔ ٹی وی کا سوئچ آن کرنے سے پہلے اُسے بغل میں موجود چھوٹے کمرے اور کچن کا خیال آیا کہ وہاں کی صفائی تو اُس نے کبھی کی ہی نہیں تھی۔ فوراً ہی اُس نے ان جگہوں کی صفائی کے خیال کو جھٹک دیا کہ یہ دونوں جگہیں تو اُس نے کبھی استعمال ہی نہیں کی تھیں اس لئے وہاں کی صفائی چہ معنی۔ ٹی وی (جس کا رُخ بھی اُس نے بدل دیا تھا۔) پر ایک فربہ جسم کی مالک عورت کسی کھانے کی ترکیب بتا رہی تھی۔ اُس نے چینل بدلا وہاں دو تین سیاسی لوگ نرسودہ خیالات کی جگالی کر رہے تھے۔ اُس نے

Scanned with CamScanner

بددل ہو کر ٹی وی بند کر دیا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔

اگلی صبح ویسی ہی تھی جیسی کہ عموماً ہوتی تھی۔ لیکن اب کی بار یہ ہوا تھا کہ اُس نے شیو نہیں کی تھی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھوٹے سے بیگ کے ساتھ وہ چل پڑا تھا۔ دوسرے فلور کا موڑ مڑتے ہوئے اسے ایک کونے میں ایک بلی اپنے بند آنکھوں والے بچوں کے ساتھ بیٹھی نظر آئی۔ بلی نے اُس کی طرف خاصی بے اعتنائی کے ساتھ دیکھا اور اپنے بچوں کی فر کو چاٹنے میں لگ گئی۔ وہ ایک لمحے کے لئے وہاں رُک کر پھر چل پڑا۔ سیڑھیوں سے اترنا چونکہ ایک سہل عمل ہوتا ہے اس لئے اس وقت اس کے اندر سیڑھیاں چڑھتے وقت کوئی کڑواہٹ نہیں تھی۔ لوگ کام کاج کے لئے نکل پڑے تھے وہ بھی اُن کا حصہ بننے لگا۔ دو سو گز کے فاصلے پر جو بارونق اور زندگی کے زندہ مظاہر سے بھرپور چوک تھا وہاں پہنچ کر اُس کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ وہ اپنے پسندیدہ صاف ستھرے ریستوران میں داخل ہو گیا۔ گدی پر بیٹھے خوش اخلاق اور چاک و چوبند مالک نما منیجر نے مسکراتے ہوئے سر کی ایک نفیس سی جنبش سے اُس کا استقبال کیا۔ وہ کسی قدر خوش ہو گیا اور اپنی من پسند میز کو خالی دیکھ کر اُس کی طرف بڑھا۔ اُس کے کچھ کہے بغیر تھوڑی بعد ناشتہ آ گیا۔ بیرہ جانتا تھا کہ اُسے ناشتے میں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ سالن کے ساتھ ایک پراٹھا لیتا تھا اور پھر تیز پتی والی چائے پیتا تھا۔ دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہ یہیں پر کھاتا تھا۔ یہاں کا کک اُسے بہت پسند تھا کہ وہ اُس کی منشا کے مطابق زیادہ تیز مرچ مصالحے سے پرہیز کرتا تھا۔ ڈٹ کر ناشتہ کرنے کے بعد وہ دفتر میں آ گیا جو یہاں سے صرف پانچ منٹ کی واک کے فاصلے پر واقع تھا۔ مصیبت ادھر بھی وہی تھی کہ ہمیشہ اُس کے دفتر کی بلڈنگ کی لفٹ بھی خراب ہی ملتی تھی اور اُسے خاصا تردد کر کے چھٹے فلور پر موجود دفتر میں آنا پڑتا تھا۔

وہاں کا کام چونکہ دلچسپ تھا اور اُس کے مطلب کا تھا اس لئے وہ اب تک سیڑھیاں چڑھنے کی کوفت برداشت کئے جا رہا تھا۔ یہاں لوگوں کو شہر اور شہر کے گردونواح کے بارے میں تاریخی مواد پر مبنی معلومات مہیا کی جاتی تھیں۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کسٹمر سروس تھی جہاں پر ضروری پمفلٹ اور کتابچے بھی ملتے تھے۔ اسے اس مشین کا کل پرزہ بننا اچھا لگتا تھا۔ سوائے ایک بات کے یہاں کی ہر چیز اُسے پسند تھی۔ بندے، اُس کے کولیگ نرم خو اور ہنس مکھ تھے لیکن ایک بندہ ایسا تھا جو اُسے ناپسند تھا کیونکہ وہ خاصی تند و تیز خوشبو والا کلون استعمال کرتا تھا اور اُسے اس کی وجہ سے کئی بار چھینکنا پڑ جاتا تھا۔

(۲)

یہ اتوار تھا۔ وہ صبح دیر سے اُٹھا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ سارے کام ہی دیر سے انجام پائے تھے۔ وہ ریستوان سے ناشتہ کر کے ابھی..... لوٹا ہی تھا کہ سیڑھیوں والے دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ وہاں اپنے بالوں کی ایک لٹ سلجھاتی ہوئی کھڑی نظر آئی۔ عمر یہی کوئی تیس کے لگ بھگ ہوئی۔

وہ اُسے غمگین سی لگی۔ بولی

Scanned with CamScanner

''میں نے سنا ہے آپ کو گھر کے کام کاج کے لئے ایک عورت کی ضرورت ہے۔''

''میں اکیلا آدمی ہوں۔ کپڑے وپڑے اتنے زیادہ تو نہیں ہوں گے۔ پھر بھی مجھے ایک کپڑے دھونے والے کی ضرورت تو پڑے گی۔ کیونکہ میں کپڑے بازار سے دھلوانے کا قائل نہیں ہوں۔''

وہ اندر آ گئی ''مجھے اپنے کپڑے دیجئے۔''

واشنگ مشین تو نہیں ہے۔ ''کوئی بات نہیں میں کچھ کر ہی لوں گی۔''

اس نے الماری کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اُن دھلے اور چڑ مڑ ہوئے کپڑے نکالنے لگی۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ وہ اندر آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ کپڑے چونکہ زیادہ نہیں تھے اُس لئے اُس نے آدھ پون گھنٹے میں اپنا کام نپٹا لیا۔ وہ اندر آ کر اس کے نزدیک کھڑی ہوگئی۔

''اگر آپ کچھ دیر کے لئے باہر صحن میں چلے جائیں تو میں ادھر کی صفائی کر لوں۔''

''مگر یہ تو شاید تمہارے فرائض میں شامل نہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ کام چونکہ زیادہ نہیں اس لئے میں یہ بھی کر لوں گی۔ ویسے بھی حق حلال کی کر کے کھانی چاہیے۔ وہ مسکرانے لگی۔ اسے اُس کی مسکراہٹ اچھی لگی۔ اُس کے دانت آپس میں خوب جڑے ہوئے تھے۔ وہ برآمدے میں آ گیا تو اُس نے کمرے کی صفائی شروع کر دی۔ وہ اچھی خاصی سگھڑ لگی۔ اُس کے کام میں نفاست اور پھرتی تھی۔ وہ سب کچھ خاموشی اور بردباری سے کرتی تھی۔ زیادہ باتیں کرنے کی اُسے عادت نہیں تھی۔ وہ اندر آ گیا تو اُس نے صحن کی صفائی بھی کر لی۔ اُس نے آیندہ کے لئے نیا جھاڑو لانے کو کہا۔ اُسے چند اور اشیاء کی بھی ضرورت تھی۔ جب اس نے ان چیزوں کو لانے کا وعدہ کر لیا تو عورت نے اپنا طے شدہ معاوضہ ایڈوانس میں ادا کرنے کو کہا۔ اس نے اُسے پیشگی دے دی۔ اُس نے یہ روپے اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ لیے اور اگلے اتوار کو پھر آنے کا کہہ کر وہ چلی گئی۔

اگلے اتوار کو اُس کے آنے سے پہلے اس نے دُھلے ہوئے کپڑوں کو استری کرنے کے لئے ایک عدد بجلی کی استری بھی خریدی تھی اور ایک واشنگ مشین بھی اُس نے لا کر کمرے میں رکھ دی تھی۔ عورت کی مطلوب دیگر اشیاء تو خیر آ ہی چکی تھیں۔ ایک سال گزر گیا۔ اس سارے عرصے میں اُس نے اسے کبھی بھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ وہ اپنا ہر کام وقت پر کرتی تھی اس لئے وہ بھی اُسے اُس کی اُجرت وقت پر ادا کر دیتا تھا۔ سال کے بعد ایک تبدیلی واقعہ ہوئی۔ وہ اب اپنے ساتھ ایک ننھا منا سا بچہ لانے لگی تھی۔ اس نے جب پوچھا کہ وہ ایسے گھر پر چھوڑ کر کیوں نہیں آتی۔ تو اُس نے جواب میں کہا کہ اُس کے گھر پر اُس کی غیر حاضری میں چونکہ اس کو سنبھالنے والا اور کوئی نہیں ہوتا اس لئے مجبوراً اُسے ساتھ لانا پڑتا ہے۔ وہ کام میں لگی رہتی۔ وہ کوئی کتاب یا اخبار پڑھتے پڑھتے قریب ہی موجود بچے سے بھی کھیل

Scanned with CamScanner

لیتا تھا۔ بچہ اس سے مانوس ہونے لگا۔ اس سے اگلے سال جب یہ بچہ ایک سال کا ہو گیا تو ایک اور بچہ آ گیا اور اس سے اگلے سال ایک اور اب پہلے والا بچہ تین سال کا اور دوسرا دو سال کا ہو گیا تھا۔ دونوں ہی اسے دیکھ کر اس کی طرف لپکنے لگے تھے۔ اسے بھی اُن پر بہت پیار آتا تھا۔ بچے تھے ہی بہت پیارے۔ پھر یہ بچے بڑے ہونے لگے۔ ..... تینوں بچوں میں سے ایک جو بچی تھی وہ اس کے بہت سے کام کرنے لگی تھی۔ اس کے کپڑے اب وہی استری کرتی تھی۔ دونوں لڑکے اس کا جسم دبا دیتے تھے۔ تینوں بچے اسے ابو کہتے تھے اور اسے اُن کے ایسا کہنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اچانک ان بچوں نے اور اُن کی ماں نے آنا بند کر دیا۔ اسی دوران عدالت کی طرف سے مجھے ایک نوٹس ملا۔ یہ نوٹس اُسی عورت نے دلوایا تھا۔ اُس کے مطابق وہ اُس کا شوہر تھا اور ان تین بچوں کا باپ بھی تھا اور ایک مدت سے وہ اس عورت کے قانونی، اخلاقی حقوق اور اُس سمیت ان بچوں کا نان نفقہ بھی ادا کرنے سے قاصر رہا تھا۔ وہ چونکہ اُن کے خرچ کی عدم ادائیگی کا مرتکب ہوا تھا اس لئے عدالت نے اسے اس الزام کی صفائی کے لئے طلب کیا تھا۔ وہ اس نوٹس کو پا کر کسی قدر ڈسٹرب ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ کیا تھا۔ لیکن کچھ تھا ضرور اور اُسے اس کا سامنا خاصی ہوشمندی سے کرنا تھا۔ اس نے ایک وکیل سے مشورہ کیا۔ وہ اس کا کیس لینے پر راضی ہو گیا۔ پیشیاں شروع ہو گئیں۔ عورت کا وکیل اپنی ہی طرز کا کائیاں نکلا۔ اُس نے پتہ نہیں کہاں سے چند گواہ بھی حاصل کر لئے تھے اور وہ پورے دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ اس پر حملہ آور ہو گیا تھا۔ اس کے وکیل کے پاس اس کے دفاع کے لئے کچھ خاص مواد موجود نہیں تھا۔ ہر چیز اس کے خلاف جا رہی تھی۔ فیصلے والے دن اسے ایک خیال سوجھا۔ اس نے اس خیال کو اپنے وکیل تک پہنچا دیا تو اُس بدھو کی جان میں جان آئی۔ اُس نے وہ نقطہ جج کے سامنے دھرا۔

"جناب والا، میرے مؤکل کی رائے یہ ہے کہ انصاف کے تمام تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ اُس کا اور اُن بچوں کا DNA ٹسٹ کروایا جائے۔"

DND ٹسٹ ..... مخالف وکیل گھبرا گیا۔ وہ عورت بھی بوکھلا گئی۔ اتنے میں جج نے کہا، عدالت تھوڑی دیر کے لئے برخاست کی جاتی ہے۔ وہ اُٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ مخالف وکیل بھی ایک طرف کو کسک گیا۔ وہ عورت بھی غائب ہو گئی۔ کچھ دیر بعد گھنٹی بجنے لگی۔

"حضرات، عدالت کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے عدالت کو خالی کر دیا جائے۔" آواز عدالت کی لمبی چوڑی عمارت کے کس ستون کے پیچھے سے آ رہی تھی۔

اسے مجبوراً باہر آنا پڑا۔ لمبی کوریڈور خالی پڑی تھی۔ وہ وہاں چند لمحوں تک یوں ہی کھڑا رہا۔

اتنے میں وہ تینوں بچے بھاگتے ہوئے آئے اور آتے ہی ابو ابو کہہ کر اس میں ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ اس نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ تھوڑے فاصلے پر سے گزرتی ہوئی ایک عورت بدبدائی۔ "یہ کیا زمانہ آ گیا ہے، بچے بلک رہے ہیں اور بے حیا باپ کو ذرا بھی

Scanned with CamScanner

احساس نہیں۔ اگر تھوڑا سا دلاسا بچوں کو دے دے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

اس نے بوکھلا کر بچوں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ بچے چپ ہو گئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ چند لمحوں بعد بچے کوریڈور میں پھیل کر خوش خوش ٹہلنے لگے۔ اس نے دل میں سوچا۔ وہ عورت تو واقعی قصوروار ہے لیکن یہ بچے تو معصوم ہیں میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" اس نے جانے سے پہلے جب بچوں کو آواز دی تو دیکھا کہ بچے تو وہاں نہیں تھے۔ بہت ڈھونڈا۔ بچے نہیں ملے۔ وہ گھر آ گیا۔

اگلے اتوار والے دن ریستوران سے ناشتہ کرنے کے بعد وہ لوٹا تو چند لمحوں بعد سیڑھیوں کا دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔ اُس نے اُٹھ کر دیکھا۔ ایک سانولے رنگ کی دلکش نقوش والی عورت وہاں کھڑی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی بولی، جناب، میں نے سنا ہے کہ آپ کو گھر کے کام کاج کے لئے ایک عورت کی ضرورت ہے۔" ہاں ہے تو لیکن..... وہ اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اندر آ گئی۔ برآمدے میں پڑے جھاڑو کر اُٹھا کر وہ بولی۔ آپ تھوڑی دیر کے لئے صحن میں ہی رہیں تا کہ میں کمرے کی صفائی کر لوں۔" وہ صحن میں کھڑے ہو کر اُسے سارے کمرے میں گھوم گھوم کر صفائی کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

☆☆☆☆

نمود کی سرپرستی کیجئے
دامے درمے، سخنے، قدمے
تعاون کیجئے

نمود خرید کر پڑھیں اور اپنے
احباب کو بھی اس کارِ خیر کی
ترغیب دیں۔

Scanned with CamScanner

نور کی کہانی

مسرت کلانچوی

نور محمد کمرے سے باہر کھڑا کھڑکی سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے نانا کے پاس کچھ مہمان آئے تھے۔ نانا نے یہ کہہ کر اُسے وہاں سے بھگا دیا تھا کہ بچے بڑوں میں نہیں بیٹھتے۔ نور محمد آٹھ سال کا تھا لیکن اتنا بھی بچہ نہ تھا کہ ان کی باتیں نہ سمجھ سکے۔ اس سے پہلے بھی اجنبی مہمان اس کے نانا کے پاس آتے تھے لیکن چار ماہ پہلے فوت ہو جانے والے نور کے باپ کے تعزیت کر کے چلے جاتے تھے۔ نانا نور کو بلوا لیتا اور ان بڑوں میں بٹھائے رکھتا لیکن آج یہ کیسی باتیں تھیں.....؟ کیسے بڑے تھے.....؟

اب نور کو کچھ سمجھ آنے لگا۔ نانا کہہ رہا تھا۔

''تمہارے پاس ''وٹہ'' نہیں ہے لیکن میں اپنی مرضی کا ''ٹکہ'' ضرور لوں گا۔

مہمان بزرگ غصے سے بولا۔

''مرضی کا ٹکہ لو گئے تو شرط ہماری بھی ماننی ہوگی۔''

(وٹہ۔ جنوبی پنجاب میں اولے بدلے کی شادی پر لڑکی کا رشتہ)

(ٹکہ۔ بغیر اولے بدلے کی شادی کی صورت میں لڑکی کے وارث کو پیسہ دیا جاتا ہے)

کیسی شرط.....؟ نانا آبرو اٹھا کر بولا۔

''شرماں مٹی چھوکرا ساتھ نہیں لائے گی۔''

نور کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ تو اس کی ماں کی دوسری شادی کی بات ہو رہی تھی اور وہ جو اپنی ماں سے لپٹ کر سوتا ہے اور اس سے لوری سنتا ہے۔ وہ ماں کے ساتھ نہیں جا سکے گا.....؟

نہیں نہیں.....میری ماں نے میری بہن کے پیدا ہونے کے دس سال بعد نتوں مرادوں اور علاجوں سے اُسے اللہ سے لیا ہے۔ اس کا نانا ضرور انکار کر دے گا۔ لیکن یہ کیا.....؟ نانا نے تو ہنس کر کہہ دیا تھا۔

Scanned with CamScanner

''ٹھیک ہے اڈ..... میری مرضی کا ٹکہ مجھے دے دو..... میں چھوکر اس کی بہن کے پاس بھجوادوں گا۔ اس کا شوہر میرا پوتا ہے وہ نور کو خوشی سے رکھ لے گا۔

نور سے وہاں کھڑا رہنا مشکل ہوگیا۔ وہ بھاگ کر نیم کے درخت کے پاس گیا اور اس کے تنے سے لگ کر رونے لگا۔

اس کی ماں بھی بہت روتی تھی..... خوب تڑپی تھی۔ لیکن اس کی کون سنتا وہ تو گائے تھی۔ ایک کھونٹی ٹوٹ گئی تو دوسری سے باندھ دی گئی۔ اگلے ہی دن اس کی بہن شادو اُسے گھر لے گئی۔ شادو کی آنکھیں بھی ہر وقت سوجی سوجی روٹی روٹی لگتیں لیکن وہ نور سے کہتی۔

''چل نورو..... بھول جا اُسے..... بڑی بہن بھی تو ماں کی جگہ ہوتی ہے۔''

لیکن یہ کیسی ماں تھی۔ صبح سویرے اس کے شوہر ہاشم نے کسی کندھے پر رکھتے ہوئے آواز دی۔

''نورو کو بھیج میرے ساتھ۔ کھیتوں پر کام کرے گا۔''

شادو نے نورو کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''جا پتر..... کام کرنا سیکھ.....''

نورو کھیتوں میں بیج کا ''چھٹا'' دیتے ہوئے بڑی حسرت سے ان لڑکوں کو دیکھتا تھا جو سائیکل پر سکول پڑھنے جاتے تھے۔

اس کا باپ بہشتی کہتا تھا۔

''نورو..... تو ذرا سا اور سیانا ہو جائے گا تو تجھے سائیکل لے کر دوں گا..... تجھے سائیکل چلانی سکھاؤں گا..... تو پڑھنے جایا کرنا..... میں تجھے باؤ بناؤں گا۔''

نور کی آنکھوں میں نواب جگمگانے لگتے۔ لیکن اب اُسے یوں لگتا وہ اپنے بہنوئی کا نوکر بن گیا ہے اور اندھیری غار میں چل رہا ہے۔

''یہ لے جا..... وہ اٹھا دے..... ادھر..... آ..... اُدھر جا.....

ہاشم غصے سے بولتا اور بات بات پر تھپڑ بھی لگا دیتا۔ نورو بہن کی طرف دیکھتا تو وہ اُسے ڈری سہمی سی لگتی۔

ایک دن نانا نورو کو ملنے آیا تو نورو نے بڑی ضد کی۔

''میں اماں سے ملنے جاؤں گا۔''

نانا اُسے ماں سے ملوانے لے گیا۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر سسکنے لگا۔ سوتیلا ابا جلال نورو کو بڑے پیار سے دیکھتا رہا۔ اُسے اپنے پاس بلایا اور جیب سے دو روپے نکال کر دیئے۔ نورو شرماتے ہوئے انکار میں سر ہلانے لگا۔

''لے لے پتر..... یہ بھی تیرا ابا ہے.....''

Scanned with CamScanner

شرماں نے مسکرا کر کہا تو نورو نے پیسے لے کر جیب میں رکھ لیئے۔ جلال اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''میں شام کو تجھے اپنی گھوڑی پر بٹھا کر رقبے کی سیر کراؤں گا۔''

نورو بڑا خوش ہوا..... سوتیلا ابا کتنا اچھا تھا۔

اور پھر شام کو جلال نورو کو اپنی گھوڑی پر اپنے آگے بٹھا کر رقبے کی سیر کراتے ہوئے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔

''میں تجھے ہمیشہ اپنے پاس رکھتا۔ مجھے تیرے جیسے پیارے لڑکے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ میرا ابا یہ بات جانتا ہے۔ لیکن اسی نے ہی تجھے یہاں رکھنے سے انکار کیا ہے۔ تو میرے ساتھ رہتا تو دیکھتا میں تجھے کتنے مزے کراتا۔

جلال اُسے گھوڑی سے اتار کر گنے کے کھیت میں لے آیا..... اور کھیت کے بیچوں بیچ جا کر نور کا ہاتھ پکڑ کر اپنے تہمد کے اندر لے جانے لگا۔ نورو چیختا ہوا کھیت سے باہر کو بھاگا۔

''ٹھہر جا مردود..... خبیث..... جان سے مار دوں گا..... ادھر دیکھ..... میرے پاس چھرا ہے۔ ماں کو بتایا تو تیرا پیٹ پھاڑ کر آنتیں باہر نکال دوں گا۔''

جلال بکتا ہوا اس کے پیچھے لپکا..... سامنے سے رشید سائیکل پر آ رہا تھا۔ اس نے صورت حال دیکھی تو طنزاً بولا۔

''او لے جلالے..... شرم کر..... بیوی کے بچے کو تو چھوڑ دے۔''

پھر وہ سائیکل سے اترا۔

''چل چھوکرے۔ تجھے تیری ماں کے پاس چھوڑ آؤں۔'' گھر جاتے ہی نور نے نانا سے ضد کی..... مجھے ابھی..... اسی وقت بہن کے گھر واپس لے چلو.....''

نور حیران حیران سی ماں کو چھوڑ کر واپس شادو کے گھر آ گیا..... اور پھر وہی محنت مشقت..... بہنوئی کی گالیاں..... تھپڑ.....

گرمیوں کی جس آلود دوپہر تھی..... درخت دم سادھے بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں چونچیں کھولے ہانپ رہے تھے۔ ایک درخت کے نیچے ہاشم اور رشید بیٹھے تھے..... رشید بولا۔

''یار ہاشم..... چھوکرے کو آوارہ نہ پھرنے دیا کر..... اسے سکول میں کیوں نہیں ڈالتا.....؟''

''سکول بہت دور ہے..... کون لے جانے اور واپس لانے کے جھنجھٹ میں پڑے..... اور پھر اسے پڑھانے کے لیے میرے پاس پیسے کہاں.....؟''

رشید بولا..... ''اگر تم میری بات مانو تو لڑکا پڑھ بھی جائے گا اور تمہارے پاس بہت سے پیسے بھی آ جائیں گے.....''

پیسوں کی بات سن کر ہاشم کے منہ میں پانی بھر آیا۔ فوراً پوچھا وہ کیسے.....؟''

Scanned with CamScanner

رشید نے جواب دیا....." میں نور کو دوبئی بھجوا سکتا ہوں۔ جہاں شیخ نور کو اچھا کھلائیں پلائیں گے اور پڑھائیں گے بھی.....وہاں اونٹوں کی دوڑ ہوتی ہے۔ان کے سوار کے طور پر بچوں کو ترجیح دی جاتی ہے تا کہ اونٹ پر کم وزن ہو اور وہ تیز دوڑے۔ اور کبھی کبھی اونٹ پر بیٹھنا ہوگا۔

"لیکن مجھے کیا ملے گا.....؟" ہاشم کو دوبئی کی تفصیل سے زیادہ پیسوں سے دلچسپی تھی۔

"نوٹوں سے بھرا ہوا لفافہ.....جیسے دیکھ کر تیری آنکھیں کھلی رہ جائیں گی.....بول منظور ہے.....؟" رشید نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ہاشم نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

رات تاریک تھی.....چاند کہیں ڈوب چکا تھا.....۔

بادلوں نے آسمان کو ڈھانک رکھا تھا.....کوئی اکا دکا ستارا کہیں کہیں ٹمٹما رہا تھا۔ایک چارپائی پر نور سو رہا تھا.....اور کچھ فاصلے پر دوسری چارپائی پر ہاشم اور شادو جھگڑ رہے تھے۔

بہن کی آواز سے اچانک نور کی آنکھ کھل گئی۔شادو گڑگڑا رہی تھی۔

"نہیں نہیں.....میں نور کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔یہ ظلم نہ کر ہاشم نور اتنی دور چلا جائے گا۔پھر پتہ نہیں وہ واپس بھی آسکے گا یا نہیں۔ہم اس کی صورت دیکھنے کو ترس نہ جائیں۔

"اپنے پیار میں اس کا مستقبل خراب نہ کر.....وہ وہاں پڑھے گا اور ڈھیروں کمائے گا....."

"ہم اماں کو کیا جواب دیں گے.....؟"

"ہم بتا دیں گے کہ وہ شہر میں میرے دوست کے گھر رہتا ہے.....وہ اسے پڑھا رہے ہیں....."

وہ اسے پڑھا رہے ہیں....."

"اماں ملنے کی بات کرے گی تو.....؟ جب ہمارا جھوٹ کھل گیا تو وہ اس غم سے ہی مر جائے گی کہ اس کا ننھا سا بچہ دور پردیس غیروں میں رُل گیا ہے....."

"وہ تو جانے کب مرے.....تو ابھی میرے ہاتھوں مرے گی....."

ہاشم نے زناٹے کا تھپڑ شادو کو دے مارا۔

"تو نے مجھے مارا.....؟ تیرے ہاتھ ٹوٹیں.....تو برباد ہو....." شادو بے بسی سے بددعا ہی کر پائی اور پھس پھس کر کے رونے لگی۔

"جا نکل جا میرے گھر سے.....پر جائے گی کہاں.....؟ سگے باپ کی قبر میں یا سوتیلے باپ کی کوٹھڑی میں.....؟"

Scanned with CamScanner

شادو بالکل چپ کر گئی..... ہاشم سچ ہی تو کہتا تھا۔

نور اٹھ بیٹھا..... ہاشم نور کی چارپائی پر آ بیٹھا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"بیٹا!..... تیری بہن پاگل ہے..... یہ تو چاہتی ہی نہیں کہ تو پڑھ لکھ جائے اور بہت سے پیسے کمائے..... میں تجھے باہر بھیجوں گا۔"

نور کی آنکھوں میں پھر وہ خواب جاگنے لگے جو اس کے باپ کی باتوں سے جھلملاتے اور اب تو اُسے بہنوئی کے کھیتوں کی مشقت اور ڈانٹ ڈپٹ سے بھی نجات مل رہی تھی۔

"جائے گا نا تو دوبئی؟" ہاشم نے پیار سے پوچھا۔ نور نے سر ہلا دیا۔

سورج کھجور کے درختوں کے پیچھے سے طلوع ہو رہا تھا۔

آسمان پر لالی بکھری ہوئی تھی۔ پرندے اپنے گھونسلوں سے نکل کر انجانی منزلوں کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔

ہاشم کے گھر کے باہر ایک جیپ رُکی۔ ہارن کی آواز پر ہاشم لپک کر باہر گیا۔ رشید کے ساتھ ایک تگڑا سا آدمی تھا۔ کلف لگے سفید شلوار قمیض میں ملبوس۔ اس کی سنہری قیمتی گھڑی پر تو ہاشم کی نظر ٹک ہی گئی۔ اجنبی نے ہاشم سے ہاتھ ملایا اور ساتھ ہی نوٹوں سے بھرا لفافہ اسے تھما دیا۔

"چھوکرے کو جلدی لاؤ....." وہ رعب سے بولا۔

ہاشم اندر آیا تو شادو نور کو نئے صاف کپڑے پہنائے مکھن اور شکر سے بنی چوری اپنے ہاتھوں سے کھلا رہی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں پر تھرتھرا رہے تھے۔

"تیار ہے نا تو کاکا.....؟" ہاشم پیار سے بولا۔

"لالہ..... میں کتنے دنوں سے کہہ رہا ہوں..... میں امی سے مل کر جاؤں گا....."

"تجھے بتایا تو ہے تیری امی تیرے ابے کے ساتھ شہر گئی ہوئی ہے..... ہاشم نے بہانہ بنایا۔

"لالہ..... میں امی کا انتظار کر لوں گا"۔

"اب وقت نہیں انتظار کرنے کا..... جلدی کر..... کہیں تیرا جہاز اڑ ہی نہ جائے....."

"لالہ..... جہاز اس شہر کے اوپر سے گذرے گا جہاں اماں گئی ہے؟"

"ہاں نورو....."

"میں جہاز میں سے دیکھوں گا تو اماں نظر آئے گی.....؟"

"ہاں نورو..... بس اب اور باتیں نہ کر....."

Scanned with CamScanner

بڑی طرح دھڑک رہا تھا..... لگتا تھا سینہ توڑ کر باہر آ گرے گا اور وہ سمندر کی لہروں میں ڈوب کر مر جائے گا۔ اس نے اماں اور بہن کو پکارنے کی کوشش کی لیکن آواز نہ نکل سکی۔ تمام راستہ اس نے آنکھیں بند کر کے گذارا۔ آخر کار وہ سمندر کے دوسرے کنارے پہنچ گئے۔

لیکن وہاں وہ مرد اور عورت نور کو ایک اجنبی کے حوالے کر کے نجانے کہاں چلے گئے۔

صبح ہو چکی تھی۔ نور نیند سے بیدار ہو چکا تھا اور آنکھیں مل مل کر کار کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

یہ سرزمین زیادہ اجنبی نہ تھی..... وہی صحرا..... اڑتی ریت..... لمبی کھجوریں..... اور اڑتے صحرائی پرندے..... نور کو اپنا وجود بھی اس کونج کی طرح لگ رہا تھا جو اپنی ڈار سے بچھڑ چکی تھی۔ اُسے اپنے دوست بھی یاد آنے لگے۔

جن کے ساتھ وہ اپنے لبّا والے گھر کی گلی میں پھکتا تھا۔ صحرا میں واقع چند گھروں میں سے وہ ایک ایسے گھر میں آ چکا تھا جہاں اس جیسے ڈرے سہمے پانچ اور بچے بھی تھے۔ دو بچے اُسے اپنی شکل صورت کے لگے۔

دو زیادہ کالے تھے..... گھنگریالے بالوں والے..... ایک بچہ سب سے الگ لگتا تھا..... نور ایک ایک بچے کو باری باری دیکھ رہا تھا..... شاید کوئی اس سے کوئی بات کرے..... کوئی نہ بولا..... آخر نور نے ہی بات شروع کی۔

"ہمارا سکول یہاں سے کتنی دور ہے.....؟"

اس کی بات سنکر نور کی شکل والے لڑکے ہنسنے لگے۔

باقی تین چپ رہے۔ انہیں نور کی زبان سمجھ ہی نہ آئی تھی۔

"بولو نا....." نور بولا لیکن ہنسنے والے بچے بھی چپ رہے۔ رات ہوئی اور نور ان بچوں کے ساتھ نیچے چٹائی پر سو گیا۔

"اٹھو..... کسی نے گرجدار آواز کے ساتھ نور کو ٹھوکر لگائی۔ نور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ صبح ہو چکی تھی۔

نور نے دیکھا ٹھوکر لگانے والا آدمی باہر نکل گیا تھا۔ کمرے میں اب صرف وہی ہنسنے والے دو لڑکے رہ گئے تھے۔ وہاں ان کے ناشتے کے لیے ڈبل روٹی کے ٹکڑے رکھے تھے جو نور کو زرا اچھے نہ لگے۔ دوپہر کو ابلے ہوئے چاول ملے جنہیں کھاتے ہوئے نور کو ابکائی سی آئی۔ ویسے بھی اُسے کھانے سے زیادہ سکول جانے سے دلچسپی تھی۔

اس نے پھر پوچھا۔

"کیا کل ہم سکول جائیں گے....."

"ہم یہاں پڑھنے نہیں آئے" ایک لڑکے نے جواب دیا۔

"تو پھر....." اس نے پوچھا۔

"ہم یہاں اونٹوں کی سواری کرنے آئے ہیں۔" دوسرے بچے نے جواب دیا۔

Scanned with CamScanner

اونٹ کی سواری تو میں اپنے گاؤں میں بھی کرتا تھا۔اس کے لیے میں اتنی دور آیا ہوں۔

''اونٹ پر بیٹھے گا تو سب پتہ چل جائے گا.....''

اور پھر چند دن بعد اُسے پتہ چل گیا۔صحرا میں لمبے لمبے کرتے پہنے اور سروں پر رومال باندھے لوگ جمع تھے۔

جو ایک دوسرے کو یا شیخ یا شیخ کہہ رہے تھے۔

کچھ اونٹوں پر بچوں کو باندھا جا رہا تھا۔بچے رو رہے تھے۔

ایک آدمی نے نور کو بھی اونٹ پر ڈالا اور باندھ دیا۔

یہ کیسی اونٹ کی سیر ہے.....؟اس طرح باندھ کر.....؟

لوگوں کے سامنے تماشا بنا کر.....؟اس کا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔اس کے بدن پر لرزہ طاری تھا۔اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اچانک اونٹ دوڑنے لگے.....نور کو جھٹکے لگے.....ایسا لگا۔

اس کا جوڑ جوڑ ہل کر اس کے جسم سے الگ ہو کر نیچے جا گرے گا۔وہ زور سے چیخا.....اس کی چیخ دوسرے بچوں کو چیخ و پکار میں گم ہو چکی تھی۔چیخوں سے زمین و آسمان لرزتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔اونٹوں کی رفتار اور بڑھ گئی تھی۔فضا میں عربوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔نور اپنی ماں کو پکارتا رہا۔بی بی اور لالہ کو پکارتا رہا اور پھر نجانے کب بہوش ہو گیا۔

اُسے ہوش آیا تو وہ اسی کمرے میں چٹائی پر پڑا تھا۔اس کا انگ انگ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔پیاس سے گلے میں کانٹے اگ آئے تھے۔وہ کراہنے لگا۔

ایک لڑکے نے اُسے پانی پلایا اور مری مری آواز میں بولا۔

''ہم اس کام کے لیے یہاں آئے ہیں.....''

یہ قیامت ہر مہینے ڈیڑھ مہینے اور نور پر ٹوٹتی تھی۔اب نور کو پیسے بھی ملنے لگے تھے جو وہ اپنی صندوق میں رکھ دیتا اور سہانے سپنوں میں کھو جاتا۔وہ سوچتا کہ جب میں واپس اپنے گاؤں جاؤں گا تو یہ پیسے اپنی ماں کو دوں گا اور کہوں گا.....اماں اپنے خاوند کو چھوڑ کر میرے پاس آ جا.....دیکھ میں کتنا کماؤ بیٹا ہوں.....تیرے لیے کتنے پیسے کما کر لایا ہوں.....یہ لے میرے ہاتھوں کی کمائی.....پھر وہ میرے ہاتھ پکڑ کر چومے گی.....مجھے سینے سے لگائے گی.....میں کہوں گا.....مجھے اپنے بازو پر سر رکھ کر سلا.....مجھے لوری سنا.....مجھے کہانی سنا.....مجھے اپنے ہاتھوں سے چوری کھلا۔

اور پھر نگران لڑکا خالد گندی سی گالی دے کر نور کو خوابوں کی دنیا سے واپس کھینچ لاتا.....وہ جو ماں کے ہاتھوں سے چوری کھا رہا

ہوتا اُسے ابلی ہوئی سبزی اور ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا پکڑا دیا جاتا۔

''میرا پیٹ اس کھانے سے نہیں بھرتا..... میں بھوکا رہتا ہوں۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ خالد نے پھر اُسے گالی دی۔

''تو کیا چاہتا ہے زیادہ کھانا کھائے اور موٹا ہو جائے..... تو موٹا ہو گیا تو تیرا اونٹ تیز کیسے دوڑے گا..... چھوڑ دے سارے نخرے..... نہیں تو ایسا دماغ سیدھا کروں گا کہ یاد رکھے گا۔''

اور پھر واقعی ایک دن خالد نے اُسے سیدھا کرنے کی ٹھان لی۔ آج نور کی طبیعت ٹھیک نہ تھی..... جی ماندا تھا..... سر میں درد تھا..... ایک دو بار نور نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ پایا..... خالد اندر آیا اور حسب معمول اُسے ٹھوکر ماری۔

''اٹھ جا.....''

نور ہڑبڑا کر اٹھا اور چکرا کر گر پڑا۔

''چل..... اونٹ کی سواری کر.....''

''آج میری طبیعت ٹھیک نہیں.....''

''چل بہانے نہ بنا..... اٹھ کھڑا ہو.....''

''کہا نا..... میں نہیں جاؤں گا.....''

''تو انکار کرتا ہے..... تیری یہ مجال.....''

خالد نے نور پر ڈنڈے برسانا شروع کر دیئے..... نور چیختا رہا.....

اسی طرح جیسے وہ اونٹ کی سواری کرتے ہوئے چیختا تھا۔ لیکن خالد اسی طرح ڈنڈے برساتا رہا اور نور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

آج پھر صدنور کو اونٹ پر باندھ کر اونٹ کو بھگانا تھا۔ وہ ایک مردہ جسم کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں..... اُسے لگ رہا تھا آج اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ وہ ضرور وہاں چلا جائے گا جہاں اس کا ابا چلا گیا ہے۔

اور پھر آج تو اونٹ کے جھٹکے بھی انتہائی شدید تھے۔ نجانے کب جھٹکوں سے اسی ڈھیلی ہوئی اور نور اونٹ سے پھسل کر نیچے جا گرا..... اس کی ٹانگ اونٹ کے پاؤں تلے ملی گئی۔

نور کی ماں شرماں مجھے نور کی اتنی کہانی سنا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی..... پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آؤ میں تمہیں نور سے ملواؤں۔

شرماں مجھے کوٹھڑی میں لے گئی..... نور چارپائی پر لیٹا تھا..... اس کی آدھی ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

غیر گھریلو عورت

فرخندہ شمیم

''عام طور پر ایسی لڑکیاں جو بچپن ہی سے کتابوں یا کھیل کود کی شائقہ ہوں، غیر گھریلو سی ہوتی ہیں۔'' اماں کہا کرتی تھیں، یہ لڑکیاں ہوتی ہی نہیں۔ ان کے اندر مرد بستا ہے جسے اچھل کود، لمبے لمبے قدم اور سینہ پھلا کر چلنے کی عادت ہوتی ہے۔ پھر خالہ کا کہنا تھا کہ کچھ بھی ہو، لڑکی، لڑکی ہی ہوتی ہے۔ اسے تیرہویں سال میں احساس ہونے لگتا ہے کہ دوپٹہ کچھ قیمتی چیزیں چھپانے کے لیے کتنا ضروری ہوتا ہے۔ چودھویں سن میں اسے ایڑی بجانے سے شرم آنے لگتی ہے اور پندرہویں سن میں اسے چودھویں کا چاند حقیر لگنے لگتا ہے۔

گڑیوں کی شادی رچانے والی لڑکی یکدم اپنی گڑیا کی ماں بن جاتی ہے اور تنکا تنکا اس کا جہیز جوڑتی ہے، پھر اسے رخصت کرتی ہے، اپنے گڈے داماد کے ساتھ..... اور پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے اس کی جدائی پر..... پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی لڑکی غیر گھریلو ہو سکتی ہے؟ اصل میں یہ قضیہ شہناز کی وجہ سے ابھرا تھا۔ اماں بی کا کہنا تھا لڑکی ذات ہے، بھلے سے خوب پڑھ گئی ہے، اچھی نوکری پر بھی لگی ہوئی ہے۔ لیکن آخر گھر بسانے کے لئے کوئی گھریلو ہنر بھی تو ضروری ہے۔ اس طرح تو یہ بالکل مرد بن کر رہ جائے گی، کمانے والی مشین کی طرح..... میں آج ہوں کل نہیں۔ باپ ویسے بھی سر پر نہیں ہے۔ انہوں نے خوب پڑھا لکھا دیا۔ اس کو اور خود چل دیئے..... بھائی بھاوجوں کے در پڑی تو سمجھو موری کی اینٹ ہوئی۔

کوئی بات نہیں آپا۔ آخر بھائی اپنی ذمہ داری نبھائیں گے اور شادی ضرور کریں گے اپنی بہن کی۔ خالہ بی نے تشفی دی..... لیکن اماں بی اور خالہ بی کو کیا پتہ تھا کہ دونوں کی روانگی کا بگل ایک ساتھ ہی بج جائے گا۔ چند ہفتوں کے فرق سے دونوں سدھار گئیں۔ شہناز ہکا بکا رہ گئی..... اسے تو نوحہ بھی کرنا نہیں آتا تھا..... پٹر پٹر دیکھتی رہی چاروں طرف..... پورا محلہ پُرسے کے لیے آیا اس کے پاس..... وہ گم سم رہی..... لوگوں نے کہا ''یہ بچپن سے بڑی صابر ہے، بہت کم بولتی ہے، کبھی کسی سے نہیں لڑی۔ اپنی بھاوجوں کی بڑی عزت کرتی ہے۔ اپنے بھائیوں پر جان دیتی ہے، بھائی بھی آنکھوں میں بٹھاتے ہیں۔ اس نے اپنا مقام اپنی تعلیم اور محنت سے بنایا ہے۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔

Scanned with CamScanner

عورتیں اسے دعائیں دے دے کر رخصت ہوتی گئیں۔اس کی دونوں بھابیاں آپس میں سگی بہنیں بھی تھیں۔ محلے بھر میں شہناز کی لیاقت کے قصیدے سن سن کر اس سے کچھ خائف تو تھیں ہی.....حسد کی ایک چھوٹی سے انگیٹھی بھی ان کے اندر جلتی رہتی تھی۔

اماں اور خالہ بی کی تعزیت کے لیے آنے والوں کا سلسلہ ابھی تھما نہیں تھا۔دونوں بھابیاں دنیا دکھائی کے لیے عورتوں کے پاس غمزدہ صورت لیے بیٹھی رہتیں اور ان کے لیے چائے بھی بنا دیتیں۔لیکن اب دونوں پر بیزاری چھانے لگی تھی۔ نئے مہمان آئے تو ایک فوراً بڑبڑائی۔

''لو اب پھر چائے بناؤ ان کے لیے''

لیکن شہناز نے روک دیا۔

''آپ رہنے دیں بھابھی، میں بنالوں گی۔''

''تم؟ بھاوج ہلکے طنز کے ساتھ بولی۔''شہناز تم چائے بنالوگی؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں'' شہناز بولی اور کچن میں چلی گئی۔

دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھ کر استہزائیہ مسکرائیں۔

شہناز چائے بنا کر لے آئی۔مہمانوں نے اطمینان سے چائے پی لی۔بھاوجوں کا خیال تھا چائے کے ذائقے پر عورتیں بُرے بُرے منہ بنائیں گی۔شہناز کو گھر داری آتی ہی کہاں تھی۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

زندگی کی گاڑی مرنے والوں کے ساتھ رک نہیں پاتی۔شہناز کا گھرانہ بھی معمول پر آ گیا.....وہی دفتر.....وہی گھر واپسی.....شہناز کی ڈیوٹی سات گھنٹے کی ہوتی تھی، پہلے تو واپسی بڑی مسحور کن لگتی تھی۔اماں بی اور خالہ اس کی راہ تک رہی ہوتی تھیں۔اماں اس کی واپسی پر جلدی جلدی کھانا گرم کرتی تھیں اور جب تک وہ کپڑے بدل کر اور فریش ہو کر آتی۔خالہ بی کھانے کی ٹرے لگا چکی ہوتیں اور پھر تینوں اکٹھے کھانا کھاتے.....لیکن اب وہ موسم کہاں تھے،اب تو تنہائی کی اک رُت تھی جو روزانہ شہناز کا استقبال کرتی تھی.....وہ گھر آتی تو پہلے کچن جا کر کھانا گرم کرتی، میز پر لگاتی اور اکیلی بیٹھ کر کھانے لگتی۔کوئی نہیں ہوتا تھا آس پاس.....بھائی کاروبار پر، بھابیاں اپنے اپنے کمروں میں، بچے کھیل کود میں.....وہ ہمیشہ چپ رہتی تھی جیسے کوئی ٹھہرا ہوا پہاڑ.....یہ بھی غنیمت تھا کہ اسے وقت ہی بہت کم ملتا تھا گھر میں.....آفس کی مصروفیت اور تھکا دینے والا لمبا سفر.....وہ کھانا کھاتے ہی سو جاتی تھی۔البتہ چھٹی والے دن اسے دونوں بڑے بھائیوں کے ساتھ ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا بھرپور وقت ملتا تھا۔اس روز وہ اپنی بیویوں سے کہہ کر شہناز کی پسندیدہ ڈشیں بنواتے تھے۔دونوں بھابیاں ناک بھوں چڑھا کر پکاتی رہتی تھیں۔انہیں پتہ

Scanned with CamScanner

تھا دونوں بھائی بہن سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور انکار پر ان کی درگت بنا سکتے ہیں۔

''شہناز کسی روز ایسی کوئی چیز اپنے ہاتھ سے بناؤ کہ تمہارے بھائی انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ بڑی بھابی نے ایک دن کھانے کے دوران ایک عیارانہ تیر پھینکا۔'' شہناز چپ ہوگئی۔

ارے نہیں بھئی..... شہناز کو ایک دن تو ملتا ہے چھٹی کا، وہ بھی چولہے میں جھونک دے؟ بھائی نے پیار سے کہا۔

اسی طرح گھر داری آتی ہے ناں لڑکیوں کو؟ چھوٹی بھاوج زیر لب بدبدائی۔

''سیکھ لے گی سب کچھ، جب وقت آئے گا'' چھوٹا بھائی رسان سے بولا۔

اور کون سا وقت آئے گا..... کتنی چھوٹی ہے آخر یہ؟ دل ہی دل میں بھاوجوں نے جل کر سوچا، لیکن شوہروں کی تیز نظروں سے سہم گئیں۔

بالآخر انہوں نے شہناز کی بے عزتی کرانے کا ایک پلان سوچ لیا۔

اگلا سنڈے آتے ہی دونوں بھاوجوں نے اپنی ماں کی بیماری کا بڑا مضبوط جواز گڑھا اور میکے کی راہ لی۔ اس پر بڑا ستم یہ کیا کہ ایک رشتے کرانے والی عورت کو تیار کیا کہ وہ کوئی فرضی رشتہ لے کر سنڈے کی شام ان کے سسرال آئے اور ان کے شوہروں کے سامنے شہناز کے رشتے کی بات ڈالے۔

دونوں کو پتہ تھا، گھر میں پکانے والی دونوں عورتیں موجود نہیں، شہناز کو کوکنگ نہیں آتی، اس کے غیر سگھڑاپے کا پول کھل جائے گا اور بھائیوں کی بھی بے عزتی ہوگی..... فون پر بھابیوں نے اپنے شوہروں کو رشتے والی خالہ کے بارے میں بتایا اور شہناز کو بہت سے لوازمات تیار کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

''آئی ایم سوری شہناز'' تمہیں سب کچھ پہلی بار اکیلے کرنا پڑے گا۔ ہم دونوں کو اماں کی بیماری کی مجبوری نہ ہوتی تو اتنے اہم موقع پر کبھی میکے نہ آتیں۔'' شہناز خاموش رہی، البتہ اس کے ماتھے پر فکر کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ اتنی چیزیں اسے کاہے کو بنانی آتی تھیں۔۔۔ دہی بھلے، گاجر کا حلوہ، چنا چاٹ، چکن تکہ روسٹ، پوریاں۔۔۔ اور پھر وقت اتنا کم۔۔۔ ساتھ کوئی مددگار بھی نہیں۔۔۔ بھائیوں نے کہا ''تم تردد نہ کرو بہن۔۔۔ ہم سب کچھ باہر سے لے آئیں گے لیکن شہناز نے بھابیوں کی اس سازش کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور بھائیوں سے مسکرا کر کہا: ''ایسے موقعوں پر ہی تو کچھ نیا سیکھنے کو موقع ملتا ہے بھائی، بھلے سے تجربہ ناکام رہے۔'' پھر اس نے شاٹ لسٹنگ کی۔ وقت کی کمی اور معیار کے پیش نظر پوری فہرست میں سے صرف دو چیزیں بنائیں۔ کراکری خوب صاف کر کے ٹرالی میں لگائی، رشو پیپر ترتیب سے رکھے۔ روم فریشر کیا، خود غسل کر کے سادہ کپڑے پہنے اور کوئی میک اپ نہیں کیا۔ وقت مقررہ پر خالہ رشتے والی ایک خاتون کو لے کر آ گئی۔ جو فرضی عورت تھی، خالہ سچ مچ کا کوئی رشتہ نہیں لائی تھی۔۔۔ وہ تو شہناز کی بھابیوں کے منصوبے پر عمل کی غرض

Scanned with CamScanner

سے اس کے غیر گھریلو پن کی تذلیل کرنے آئی تھی۔

دونوں خواتین شہناز کے بھائیوں سے بھی رسمی طور پر ملیں جیسے ہی چائے کے لوازمات پیش ہوئے وہ بے عزتی کی آرزو میں ٹوٹ پڑیں۔ دہی بھلے پلیٹ میں ڈالتے ہوئے خالہ رشتے والی بولی: ''دیکھوں تو کیسے بنائے ہیں بٹیا نے۔۔۔ اسے تو پکانے وکانے کا وقت ہی کہاں ملتا ہوگا۔''

''اصل میں ابھی ہماری بہن گھر داری سیکھ رہی ہے اب چونکہ بڑی پوسٹ پر ہے۔ اس لئے دفتر میں جواب دہی نہیں ہے۔ وقت نکال رہی ہے گھر داری کے لئے اب۔ بڑے بھائی نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ شہناز مسلسل خاموش تھی۔ زندگی میں بعض ایسے موقع بھی آجاتے ہیں کہ بڑے بڑے مقرر بھی تقریر بھول جاتے ہیں۔۔۔ لیکن اسے تعجب ہوا۔ دونوں عورتیں ناک منہ چڑھائے بغیر دہی بھلے کھا رہی تھیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بھائیوں کا چہرہ دیکھا وہ بھی اطمینان سے کھا رہے تھے، اسے بھروسہ سا ہوا۔

پہلی بار بنائے ہیں بٹیا نے۔۔۔ پھر بھی بُرے نہیں، خالہ رشتے والی بول ہی پڑی۔

نہیں نہیں اچھے ہیں بھئی۔ دوسری عورت اضافہ کیے بغیر نہ رہی۔

شہناز کی جان میں جان آ گئی۔ بھائی فتح مند ہوئے۔

خالہ رشتے والی شرمندہ ہوئی، وہ سچ مچ کا رشتہ کیوں نہ لائی، اس لڑکی کے لئے۔۔۔ ذرا سی عمر کی زیادہ ہے ناں اور وہ بھی بس چالیس بیالیس۔۔۔ بعد میں دیگر لوازمات بھی کھائے گئے اور شام اختتام پذیر ہوگئی۔۔۔ شہناز کی بھابیاں اس شکست پر سینہ پیٹ کر رہ گئی تھیں۔ دونوں کی توقع کے برخلاف خالہ رشتے والی ایک خوبصورت پروفیسر کا رشتہ بھی لے کر آ گئیں شہناز کے لئے اور اس قدر تعریفیں کیں شہناز کی شکل عقل کی کہ بھابیاں پاؤں پٹخ کر رہ گئیں۔۔۔ وہ چیں بچیں تھیں کہ سب سے زیادہ تعریف شہناز کے گھریلو پن کی ہو رہی تھی۔۔۔ بھائیوں کو رشتہ بہت پسند آیا۔۔۔ شہناز سے پوچھا گیا۔۔۔ وہ کائنات شمالی دریاؤں کی طرح منجمد تھی۔ شادی کے تصور سے اسے کبھی نہیں گدگدایا تھا۔۔۔ اماں اور خالہ کے جانے کے بعد تو وہ سائبریا کی ایک ٹھہری ہوئی برف بن گئی تھی جسے کوئی بھی سورج نہیں پگھلا سکا تھا۔۔۔ وہ اماں اور خالہ بی کے حصار سے کبھی نکل ہی نہ سکی تھی۔۔۔ اس نے بس اماں اور خالہ کے ہاتھوں دلہن بننے کا خواب دیکھا تھا۔۔۔ جب وہ نہیں تو اسے سہرے اور کنگن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بھائیوں کو بتایا کہ وہ اماں اور خالہ بی کے نام سے ایک فلاحی ادارہ شروع کرنا چاہتی ہے۔ اپنی زندگی بھر کی کمائی اور وسائل کو غریب اور بے سہارا لڑکیوں کے مستقبل کو نکھارنے میں لگانا چاہتی ہے۔

پھر اس نے ایک فتح کے ساتھ اپنی بھابیوں کو دیکھا اور کہا: ''آپ شہناز کو زندگی بھر غیر گھریلو نہیں کہہ پائیں گی لیکن شہناز بار بار اپنا سگھڑاپا ثابت کرنے کیلیے آپ دونوں کی نوکری نہیں کرے گی۔''

Scanned with CamScanner

شاہین مفتی

ہجرت سے پہلے

غلام گردشوں میں اب
غلام تو نہیں مگر.....رُکی ہوئی ہیں گردشیں
حرم کے سرخ فرش پر
سرمئی لباس میں مچل رہی ہیں گردشیں
کمرہ ہائے خاص کے.....کواڑ ہیں کھلے ہوئے
مشعلیں بجھی ہوئی.....طاقچے جلے ہوئے
زرنگار چلمنیں لے اُڑی ہیں آندھیاں
نہ شاہِ کج کلاہ ہے نہ ماہرو یہاں کوئی
ایک شپرۂ سیاہ تخت نامراد پر، جاگتی ہے رات بھر
جس کے اہتمام میں
آہٹوں کے شور سے.....گونجتے ہیں بام و در
رات کے الاؤ سے پگھل رہی ہیں گردشیں
توشہ ہائے خاص میں،، ہجر لازوال کے جام احمریں میں ہے
چاند اک رُکا ہوا
جس کا فیض مختصر.....ہے دن کو رات کی خبر
فلک کی چشمِ بے نیاز، دیکھتی ہے غور سے
محل سرا کے اس طرف
نہ کوئی شہ سوار ہے، نہ کوئی راہوار ہے
نہ کوئی حوض خاص ہے، نہ کوئی گل بہار ہے
سبزہ زار جل چکے.....پیرہن بدل چکے
مگر زمیں کی کوکھ میں پل رہی ہیں گردشیں
طرح طرح کی صورتیں بدل رہی ہیں گردشیں
غلام گاہِ وقت سے نکل رہی ہیں گردشیں

تنویر قاضی

بحری قزاق

بچے
اپنی آنکھیں
دہلیزوں پر دھر آتے ہیں
''ان کے دل پتھر کے ہیں''
اور نہ جانے کتنی راتیں
جاگ گزاریں گے
مچھلی
نیلے پانی کے ازلی بھیدوں کی واقف ہو
رونے کی آواز سنو
ماہی گیر
ترا نوحہ گردی رکھیں گے
لوگ جہاز کے پیندے سے لپٹے ہیں
چندہ کرتے
جھولی پھیرتے
گلی گلی ہم ساتھ پرندوں کے پھرتے ہیں
ایلچی لوٹا ہے ناکام
رہائی کی خوش خبری سے خالی ہے پوٹلی
ایک آدھ ہی گھونٹ بچا ہے چھاگل میں
کون نکالے ہاتھ جہاز کی کھڑکی سے
گم ہوتی آوازیں
سمندر کرتا جائے شور
کھڑے ہیں تیر کمان سنبھالے
خون کے پیاسے
دل کے کالے
چاروں اور

Scanned with CamScanner

اوریا مقبول جان

عمرِ بے خواب

یہ کس اجل میں گرفتار یادِ یار ہوئی
ہر ایک شب کہ شبِ منتظر ہے برسوں سے
ہو کوئی رات کہ دن شام ہو کہ وقتِ سحر
تمہارے بعد گلابِ دلِ شکستہ کے پاس
ہوائے یاد پلٹ کر کبھی نہیں آئی
کوئی ستارہ سرِ شام بے بسی اب تو
کہیں سے ٹوٹ کے بکھرا نہیں فضاؤں میں
نہ صحنِ دل میں کسی برگِ آرزو کی صدا
نہ کوئے جاں میں کسی لمحۂ عزیز کی باس

☆☆☆☆

وہ یادِ یارِ کے ٹھہرے ہوئے سُروں کی صدا
صدا۔ کہ عمرِ گزشتہ کی بازگشت ہے اب
وہ اشک جن میں سرِ شام تیری یاد کے دیپ
کہ جن سے روشنی شہرِ پُر خیال رہی
وہ گرتے ٹوٹتے اشکوں کا کارواں جس میں
چھپا سا رہتا تھا اک قافلہ ستاروں کا

☆☆☆☆

نہ یادِ یار نہ وہ فصلِ اشک بار ہے اب
یہ وقت کتنا عجب ہے کہ اس میں خواب نہیں
تلاشِ یار نہیں، عمرِ بے قرار نہیں
وہ صبحِ درد نہیں، شامِ انتظار نہیں
حصارِ گنبدِ جاں میں وہ یادِ یار نہیں

اسلام عظمی

زرد موسم میں برگِ سبز کی جستجو

میں اگر جانتا
تم اگر مانتے
موسمِ ہجر میں شاخِ امید پر
پھول کھلتے نہیں، پھل مچلتے نہیں
میں اگر جانتا
تم اگر مانتے
ہجر کی رات میں
کوئی سورج اجالے کی چادر لیے
کھول کر بابِ شب
تن کی اندھی گلی میں اترتا نہیں
وقت کٹتا نہیں
ہجر کے شہر میں زخمِ جاں کی نمائش کہ بخیہ گری
شغلِ بے کار ہے
اور جراحت کی اُمید بھی جرم ہے
کوئی دستورِ نوحہ گری بھی نہیں
پرسشِ دل کا کچھ بھی وسیلہ نہیں کوئی حیلہ نہیں
سر بریدہ دریدہ ہر اک شاخِ تن
ہر طرف ہر گلی
مردہ لمحوں کی اڑتی ہوئی راکھ ہے خاک ہے
خیمۂ جاں میں پھر بھی کہیں نہ کہیں
ایک جگنو سا تارہ ہے زندہ ابھی
کوئی موسم بھی ہو ہم رکابِ ہوا
ایک خوشبو ہے محوِ سفر دم بدم
ہر قدم خوشبوؤں میں نہائی ہوئی روشنی
روشنی جو کہ محتاجِ سورج نہیں
روشنی جو کہ شب سے بھی خائف نہیں
میں اگر جانتا
تم اگر جانتے
یوں اجالوں کے پیچھے نہیں بھاگتے
یوں اندھیروں سے ڈر کر نہیں بھاگتے

Scanned with CamScanner

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

عنایت علی المعروف ماسٹر ناتھ

(پاکستان کی پہلی فلم ''تیری یاد'' کے میوزک ڈائریکٹر)

تحریر و تحقیق: پروفیسر سلیم الرحمٰن

برصغیر پاک و ہند میں جہاں جہاں تھیٹریکل کمپنیاں (بمبئی۔کلکتہ۔لاہور۔بنارس) اور نوٹنکیاں قائم تھیں۔وہاں وہاں قریب اور دور دراز کے علاقوں میں دینے والے سازندے، سازنواز، مختلف سازگر اور میوزک ڈائریکٹر اکٹھے ہو گئے تھے کہ یہی ان کا ذریعہ معاش ٹھہرا تھا۔ابتداء میں تھیٹرلکل کمپنیوں سے وابستہ مختلف میوزک ڈائریکٹر۔مختلف سازندے، مزامیر ساز مختلف اداکار اداکارائیں (یہی گلوکار اور گلورائیں بھی تھے) پوری یکسوئی سے تھیٹروں سے وابستہ رہے تھے۔

بیسویں صدی عیسوی میں جب برصغیر میں گراموفون ریکارڈنگ کمپنیوں نے باضابطہ طور پر اپنا کام شروع کیا تو تھیٹر سے وابستہ انہی مذکورہ فنکاروں کی خدمات حاصل کیا کیونکہ ان کے سازوں اور ان کی آوازوں کے بغیر گراموفون ریکارڈ کے تیار ہونے کا تصور ممکن ہی نہیں تھا۔یوں گراموفون کمپنیوں کی آمد سے ان فنکاروں پر وسیلہ رُزق اور کشادگی رزق کے مزید دروازے وا ہوتے چلے گئے۔

یہ ایک اٹل اور نا قابل تردید حقیقت اپنی جگہ پر قائم دائم ہے کہ ''مقررہ سمے سے پہلے اور بھاگ سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔'' تاہم مذکورہ فنکاروں کے لیے دوڑ دھوپ کا ایک نیا میدان سامنے آ گیا پھر بمبئی کلکتہ اور لاہور (جو بعد میں برصغیر میں فلم سازی کے تین بڑے مرکز بنے) کی تھیٹریکل کمپنیوں نے خاموش فلم ساز اداروں کی شکل اختیار کر لی پھر ان فنکاروں کی اکثریت خاموش فلموں میں اُس زمانے کی تکنیک کے مطابق موسیقی دی۔بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی کے وسط میں ریڈیو کی آمد (برصغیر میں) کے ساتھ ہی ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں آنا شروع ہوا تو ان موسیقی سے متعلقہ فنکاروں کے لیے ایک اور میدان عمل سامنے آ گیا اس کے متوازی ناطق فلمیں منظر عام پر آنے لگیں مگر قدیمی موسیقاروں اور سازندوں (یہاں قدیمی سے مراد بیسویں صدی عیسویں کی پہلی اور دوسری دہائی ہے) تھیٹر کے

Scanned with CamScanner

معدوم ہو جاتے ہی وفاداری بشرط اُستواری کے مصداق گراموفون ریکارڈنگ کمپنیوں کے ساتھ ہی رابطہ اُستوار رکھا۔ پہلے تھیٹرز میں اور پھر گراموفون کمپنیوں میں ملازمت کرنیوالے سازندوں۔ موسیقی دانوں اور میوزک ڈائریکٹرز میں سے بعض نے آگے چل کر انفرادی طور پر بحیثیت فلم میوزک ڈائریکٹر کے بڑا نام پایا اور فلمی نغموں کی بے مثل طرزیں تخلیق کیں۔

ان سازندوں میں بعض کی شہرت بعد میں بحیثیت میوزک ڈائریکٹر پورے برصغیر میں پھیل گئی۔ ریکارڈنگ کمپنیوں میں ساز بجانے اور ان پر مہارت تامہ رکھنے والے وابستہ فنکاروں کے لیے انگریز "صاحب بہادر نے ایک لفظ ماسٹر" متعارف کروایا۔ یہ لفظ اپنے اندر ایک خاص معنویت، مہارت اور ہنرمندی کے مفاہیم رکھتا ہے، اور ایک عرصے تک اسے تکریم فن حاصل رہی اور آج ہی کچھ بڑے بڑے موسیقاروں کے نام کا مستقل حصہ بن چکا ہے۔

ماسٹر مادھو، ماسٹر محمد، ماسٹر دھومی خاں، ماسٹر ومودر، للوابائی ماسٹر، ماسٹر کرشنا راؤ، ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر عنایت حسین، ماسٹر ناتھ..... اسی زمانے کی یادگاریں ہیں۔ بعد کے دور میں ماسٹر منظور اور ماسٹر عبداللہ تک اس لفظ نے اپنی شناخت قائم رکھی۔ بہرحال آیئے کچھ دیر کے لیے ذرا دوبارہ خاصا پیچھے چلتے ہیں۔ بات ہو رہی تھی۔ پینسٹھ، ستر برس قبل کے سازندوں کی جنہوں نے تھیٹر۔ خاموش فلم، ناطق فلم، ریڈیو (تھیٹر کے فوراً بعد بالخصوص گرافون ریکارڈنگ کمپنیوں میں) ہر میدان میں اپنی خدمات سے موسیقی کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ ان سازندوں میں ایک کثیر تعداد ایسی بھی تھی جو انفرادی طور پر تو بحیثیت میوزک ڈائریکٹر کامیاب نہ ہو سکی۔ مگر غیر فلمی ریکارڈوں میں یعنی اٹھتر کی رفتار والے گراموفون ریکارڈوں میں اُنہوں نے بڑی لاجواب طرزیں تخلیق کیں شومئی قسمت کہ ان کی انفرادی تفصیل کا ریکارڈ معدوم ہو چکا ہے۔

انہی میں کچھ ایسے اعلیٰ پایہ کے فنکار بھی تھے جو عمر بھر ایک سازندے کی حیثیت سے ان گراموفون کمپنیوں سے وابستہ رہے اور اپنے تمام تر کامل دستگاہ فن کے باوجود گمنامی میں دنیا چھوڑ گئے۔..... بس رہے نام اللہ کا.....!

ان گمنام اور کم جانے گئے فنکاروں میں ایک قلیل تعداد ایسے جید ہنرمندوں کی بھی تھی جو بہت سارے ساز یکساں مہارت سے بجا لیتے تھے اور چونکہ یہ ان کا آبائی پیشہ تھا اس لیے انہیں مختلف ساز بنانے اور ان کی مرمت کرنے پر بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔

انہی ہر فن مولا فنکاروں میں ہز ماسٹر وائس سے وابستہ آج ہم ایک ایسے سازندے ایسے انوکھے فنکار کا ذکر خیر کرتے ہیں۔ کہ جنہیں آج سے ساٹھ، پینسٹھ برس قبل "ماسٹر ناتھ" کے نام سے جانا جاتا تھا جو مذکورہ ریکارڈنگ کمپنی میں ایک PIAONIST یعنی پیانو نواز کی حیثیت سے منسلک رہے تھے۔ انہیں بیشتر سازوں کے بنانے اور ان کو بجانے پر خداداد ملکہ حاصل تھا۔

مگر ایک دلچسپ اور چونکا دینے والا پہلو یہ تھا کہ "ماسٹر ناتھ" نے تاحیات نہ تو ایسا ساز بنایا نہ مرمت کیا اور نہ ہی عمر بھر بجایا کہ جسے منہ سے بجایا جاتا ہے۔ انہوں نے تاحیات اس عمل سے سختی کے ساتھ احتراز کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پھونکا ساز، یعنی Blowing

Scanned with CamScanner

Instrument میں کسی کے جوٹھے ساز کو منہ لگانا پڑتا ہے اور ماسٹر ناتھ کا مقولہ تھا: ''جوٹھ اور جھوٹ دونوں انسان کو لے بیٹھتے ہیں۔''

پھونک سے بجنے والے سازوں میں بانسری۔ شہنائی، کلارنٹ، الغوزہ، بین، طوطی، ماؤتھ آرگن، مرجنگ سرفہرست ہیں یہ ساز ماسٹر ناتھ نے عمر بھر نہ بجائے نہ بنائے۔

جوٹھ سے اُن کے حیرت انگیز اور دلچسپ احتراز کا تذکرہ آپ اگلی سطور میں مکرر ملاحظہ فرمائیں گے۔

فی الحال ماسٹر ناتھ کا ایک اجمالی تعارف اور سوانحی خاکہ نذر مطالعہ ہے۔

انہیں پاکستان کی پہلی فلم ''تیری یاد'' کے میوزک ڈائریکٹر ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور یوں یہ پاکستان کے پہلے قلمی میوزک ڈائریکٹر گردانیں جاتے ہیں۔

ایک مشہور و معروف فنکار گھرانے کے فنکار سربراہ..... ماسٹر ناتھ..... جنہیں اسے جہان فانی سے رخصت ہوئے قریباً چالیس برس ہو چکے ہیں۔

عنایت علی المعروف ماسٹر ناتھ، اداکارہ رانی کرن، ماضی کی جانی پہچانی مشہور و معروف اداکارہ آشا پوسلے (فلم تیری یاد آئی کی ہیروئین) عہد ماضی کی جواں مرگ خوبصورت گلوکارہ کوثر پروین اور تین بہنوں کے اکلوتے بھائی شمشیر علی خاں مرحوم ریڈیو اور ٹی وی کے والکن نواز اور منجھے ہوئے سازندے تھے ماسٹر ناتھ ہی کے کنبے کے افراد ہیں وہ ان چاروں مذکورہ فنکاروں کے والد بزرگوار تھے۔

ماسٹر ناتھ..... (عنایت علی) 1903ء میں موضع کرتار پور ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بھائی سندر نے ہی من جانب اللہ بہت اچھا گلا پایا تھا۔ عنایت علی المعروف ماسٹر ناتھ کو بچپن ہی سے ماحول نہایت سُر بھرا ساز و آواز سے معمور ملا تھا۔

بھائی سندر (بھائی ناتھ کے والد) کے غالباً ماموں زاد بھائی بابا مادھو تھے۔ جو جالندھر کے نہایت اعلیٰ سرگیانیوں اور موسیقاروں میں شمار ہوتے تھے۔ ماسٹر ناتھ نے بابا مادھو جالندھر والے سے (جو رشتے میں بھائی ناتھ کے تایا ہوئے) موسیقی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی متنوع سازوں کی ساخت اور انہیں بنانے میں انہیں (یعنی ماسٹر ناتھ کو) بچپن ہی سے فطری لگاؤ تھے۔ سازندوں کے گر کرنے اور انہیں بنانے کے حوالے سے قدرت نے انہیں ایک عجیب اختراع پسند فطرت سے نوازا تھا اور ذہن رسا دیا تھا۔

ذرا سیانے ہوئے تو موضع کرتار پور (جو جالندھر کے اہم مضافات میں شمار ہوتا تھا) جالندھر شہر آ کر مشہور و معروف ساز گر اُستاد اچھر سنگھ جالندھر والے کے پاس ملازمت کر لی۔ اُستاد اچھر سنگھ کی دوکان اور اچھر سنگھ اینڈ کمپنی ریلوے روڈ جالندھر میں گانے بجانے والوں۔ کن رسیاڈں اور شائقین موسیقی کے لیے نہایت اہم مرکز جانا جاتا تھا۔

ماسٹر ناتھ نے کرتار پور میں بابا مادھو جالندھر والے سے نہ صرف موسیقی کی ابجد سیکھی بلکہ کلاسیکی موسیقی کے حوالے سے راگ راگنیوں کو بھی اپنی ذات اور اپنے فن کا حصہ بنایا سونے پر سہاگہ یہ کہ انہیں متنوع سازوں کو بنانے میں بہت دلچسپی تھی۔

Scanned with CamScanner

اُستاد اچھر سنگھ جالندھری کے بنائے ہوئے ساز خصوصاً Stuinged Instruments یعنی تار والے ساز پوری دنیا میں مشہور تھے۔ اس حوالے سے اُستاد اچھر سنگھ یگانہ روزگار مانے جاتے تھے۔ اُن کے بنائے ہوئے ہارمونیم۔ ستار، وائن، پیانو، سرود، وچترو بینا دور دراز تک مشہور تھے۔ یہاں ماسٹر ناتھ نے تمام سازوں کی ساخت اور مرمت کے اسرار رموز لاگوں میں خون کی طرح شامل کر لئے تھے۔ ہارمونیم، ستار، منڈولین، ستور، Shanich gihar، سُر سہاگ خود ہی بناتے اور خود ہی بے تکان بجاتے تھے۔ ہاتھ اور انگلیاں خداداد سُریلی تھیں اس پر محنت شاقہ نے خوب رنگ بھرا کہ ماسٹر ناتھ وقت گزرنے ساتھ ساتھ سازوں کے سمپورن راگ بن گئے۔

تمام تر سازوں میں سُر سہاگ اور پیانو پر اُن کا دل بہت ٹھکا۔ جب اُن کے ساز بجانے اور بنانے کی دھوم مہاراجہ پٹیالہ تک پہنچی تو اُن کی زندگی کا ایک نیا موڑ شروع ہوا۔

اپنے عہد کے مشہور معروف اور مقبول گراموفون سنگر بھائی چھیلا پٹیالہ والے کے ساتھ اُن کی رفاقت کا آغاز بھی غالب اچھر سنگھ اینڈ کمپنی جالندھر میں ہوا ہوگا اور گمان غالب ہے کہ والی مہاراجہ تک رسائی بھی بھائی چھیلا پٹیالے والا کی وساطت سے ہوئی ہوگی۔ اسی رفاقت کے سبب ''سر سہاگ'' مہاراجہ کو پیش کرنے کا خوبصورت اور اہم مرحلہ بھی آیا۔ مہاراجہ اس وقت ہاتھی پر سوار تھا۔ سُر سہاگ پیش کیا گیا تو مہاراجہ نے نشست فیل پر بیٹھے بیٹھے بھائی ناتھ کو سُر سہاگ بجا کر سنانے کی خواہش ظاہر کی۔ بھائی ناتھ نے ارتجالاً کیا۔ ''مہاراجہ آپ سننا چاہتے ہیں تو نیچے اتر آیئے تو میں سنا دوں گا۔''

بڑی شبھ گھڑی ہوگئی کہ مہاراجہ کو اس سازنواز کی یہ شوخی یہ جرأت یہ بیباکی بہت بھاہ گئی۔ مہاراجہ ہاتھی سے نیچے اتر آیا اور پوچھا کیسے آنا ہوا۔ بہت خوش ہو کر انعام واکرام بھی دیا اور کہا کہ آج کے بعد آپ ہاتھی پر آیا کریں گے۔ یوں کچھ عرصہ بھائی ناتھ نے مہاراجہ پٹیالہ کے دربار میں سر سہاگ کو بھی نوازتے رہے۔ یہ سال اور آنے والے چند اور سال اُن کو بہت آسودگی اور مالی خوشحالی نصیب ہوئی۔ خوش وضع تھے۔ خوش شکل تھے۔ خوش پوش تھے۔ اُن کا شمار اپنے عہد کے صف اول کے Well Dressed سازندوں میں ہوتا تھا۔ چست پاجامہ۔ دوگھوڑا بوسکی کی قمیض اور عمدہ کالی شیروانی اُن کا مرغوب لباس تھا۔ آج کے جس فیشن۔ بزرگ بوڑھے بڑوں نے انہیں دیکھا تھا وہ بتاتے ہیں کہ ماسٹر ناتھ اس Get up میں بہت خوبصورت لگا کرتے تھے اور اُن کی شخصیت بہتوں میں Worth Noticing ہوتی تھی۔ جالندھر اور پٹیالے کے علاوہ انہوں نے کچھ عرصہ بنگلور میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔

1925ء میں مہر النساء مہراں سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور مہراں کے بطن سے رانی کرن۔ آشا پوسلے۔ کوثر پروین اور اکلوتے بیٹے شمشیر علی نے جنم لیا۔ اب سارے کا سارا یہ فنکار گھرانہ داعی اجل کو لبیک کہہ چکا ہے۔

کلاسیکی گائیک گوپی کرشن اور عہد ساز مغنیہ اختری بائی فیض آبادی سے انہیں بہت لگاؤ تھا اور ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

Scanned with CamScanner

بھائی چھیلا پٹیالے والا کے ساتھ ان کی گہری دوستی تھی۔ میوزک ڈائریکٹر بابا چشتی سے اور بلند پایہ پیانو نواز ماسٹر صادق (نابینا فنکار) سے بھی ماسٹر ناتھ کی گہری رفاقت رہی۔

کے ایل سہگل، محمد رفیع، زہرہ بائی انبالے والی، ماسٹر غلام حیدر اور نوشاد علی کے فن کو بہت سراہتے تھے۔

عرض کرتا چلوں کہ عنایت علی المعروف ماسٹر ناتھ کے بارے میں جو بھی معلومات اس وقت میں سپرد قلم کر رہا ہوں ان کا بنیادی ماخذ و منبع کسی حد تک رانی کرن آشا پوسلے اور بہت حد تک اُن کا اکلوتا بیٹا شمشیر علی مرحوم ہے۔ اُس وقت شمشیر علی حیات تھے اور ریڈیو لاہور کے سنٹرل پروڈکشن یونٹ میں بطور وائلنسٹ اور Orchestra manager کے طور پر ملازمت کرتے تھے راقم کے ساتھ اُن کی پرانی یاد اللہ تھی مگر اُن کے والد گرامی کے حوالے سے طویل معلوماتی گفتگو اُن کے گھر ایک بڑے ہی نجی ماحول میں ہوئی تھی اور وہ تاریخ ملاقات تھی 3 جولائی 2004ء جمعے کی شب تھی اور رات کے آٹھ بجے سے دس بجے تک ماسٹر ناتھ کے حوالے سے یہ طویل نشست جاری رہی تھی۔ اُس وقت آشا پوسلے اور رانی کرن جہان فانی سے کوچ کر چکی ہیں۔ ہاں یاد آیا کہ جب میں آشا پوسلے کا پرسا دینے اُن کے گھر گیا تھا تو اُس وقت رانی کرن حسب معمول چپ کا تعزیہ بنی بیٹھی تھیں۔ غالباً آشا پوسلے کا سوئم تھا۔ شمشیر علی کے ساتھ ایک اور صاحب بیٹھے تھے اب نام اور شکل بالکل یاد نہیں رہیں کہ سرسری سی ملاقات تھی۔ صحن۔ خالی دیگیں ادھر ادھر کرنے کی دردناک آواز مسلسل کانوں میں آ رہی تھی۔ بہر حال شمشیر علی نے میرا تعارف اُن صاحب کے ساتھ کروایا۔ پتہ چلا تھا کہ وہ گلوکار منیر حسین اور ماسٹر غلام حیدر کے قریبی عزیز تھے۔ اور تھوڑی دیر کے لیے امراؤ ضیا بیگم کا تذکرہ بھی ہوا تھا۔

میں نے اُن سے اور اُنہوں نے مجھ سے وعدہ بھی کیا کہ آئندہ جلد ہی اُن کے ساتھ ایک نشست ہوگی جس میں منیر حسین اور امراؤ ضیا بیگم کے بارے میں بہت سی باتیں کہی سنی جائیں گی تاکہ مجھے ان پر دو فنکاروں پر مضامین (الگ الگ) لکھنے میں شمولیت ہو سکے اور معلومات زیادہ سے زیادہ مستند اور صبح صادق کی طرح روشن ہوا۔ مگر افسوس کہ وہ ملاقات کبھی نہ ہو سکی اور اور یہ کہ بقول فیض۔

ع اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

آیئے اپنے موضوع ''عنایت علی المعروف ماسٹر ناتھ'' کی طرف مراجعت کرتے ہیں اُن کے بیٹے شمشیر علی (مرحوم) کے مطابق:۔

''والد صاحب کو عمدہ لباس پہننے اور اعلیٰ خوشبو لگانے کا بہت شوق تھا اپنی آسودگی اور خوشحالی کے دنوں میں انہوں نے اپنے یہ دونوں شوق جی بھر کے پورے کئے تھے۔ آموں کے رسیا تھے مزاجاً بہت خوش اخلاق اور Jolly تھے مگر بیماری کی طوالت کے باعث آخری عمر میں چڑچڑے سے ہو گئے تھے۔ انہیں اپنی سب سے بڑی بیٹی رانی کرن (شوکت ضیا) سے بہت پیار تھا۔''

ماسٹر ناتھ کی فنی زندگی کا آغاز H.M.V میں بطور پیانو سٹ ہوا۔ جالندھر سے دہلی آ کر انہوں نے اپنی اس ملازمت کا آغاز

Scanned with CamScanner

کیا اور اُن کی اپنی آواز میں چند گراموفون ریکارڈ بھی تیار ہوئے جو بالیقین بہت نایاب شمار ہوتے ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل ہی H.M.V دہلی سے اُن کا تبادلہ لاہور ہو گیا یہاں گراموفون ریکارڈ میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے اہم سازندوں کی طرح تقریباً تمام فلم ساز اداروں میں کام شروع کر دیا۔

جیسا کہ پہلے میں کہیں ایک جگہ اس مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ ماسٹر ناتھ منہ سے بجانے والے ساز استعمال نہیں کیا کرتے تھے۔ (قطعی طور پر) کہ کسی کے جوٹھا ساز کو منہ لگانا پڑے گا۔ بعینہٖ وہ کھانا بھی اکیلے ہی کھایا کرتے تھے حتیٰ کہ اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کو بھی کھانے میں شریک نہیں کرتے تھے اُس کو الگ بٹھا کر کھلایا کرتے تھے اس حیرت انگیز رویے پر بیگم کے ساتھ ان کا جھگڑا ہو جایا کرتا تھا جب دہلی ریکارڈنگ کے لیے جاتے تو اپنے ساتھ چنے لے کر جایا کرتے تھے تاکہ بازار سے انہیں کچھ کھانا نہ پڑے اور دوپہر کا کھانا ادھر لاہور میں ریکارڈنگ کمپنی میں گھر سے جایا کرتا تھا۔

تقسیم ملک کے وقت ہونیوالے ہولناک فسادات اور قتل و غارت نے دوسرے حساس فنکاروں کی طرح اُس کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا اُس کے اثرات بہت دیر تک رہے۔ تقسیم ملک کے بعد آنے والی پہلی سردیوں میں ایک شدید برودت انگیز رات کو ماسٹر ناتھ اپنے کمرے سے باہر آئے تو آناً فاناً بیمار ہو گئے انہیں لقوہ ہو گیا۔

رفتہ رفتہ روبصحت ہونے لگے تو عین انہی ایام میں دیوان سرداری لعل نے فلم ''تیری یاد'' بنانے کا آغاز کیا اس فلم کی بدنصیبی کی ایک الگ داستان ہے جو پھر کبھی سہی۔

بہر طور قیام ملک کے بعد بننے والی اس پہلی فلم کے لیے فلم ساز نے اور ہدیت کار داؤد چاند کی خدمات حاصل کیں اور بطور میوزک ڈائریکٹر عنایت علی المعروف ماسٹر ناتھ سے رجوع کیا۔ نوے دنوں کی شبانہ روز محنت کے بعد اُن بدحالی اور کسمپرسی کے دنوں میں فلم مکمل ہوئی اسے 14 اکتوبر 1948ء کو عیدالاضحیٰ کے موقع پر پربھات سما (حالیہ صنوبر) میں نمائش کے لیے پیش کر دیا گیا۔ اس فلم میں ماسٹر ناتھ کی دونوں بیٹیوں نے کام کیا۔ آشا پوسلے اور رانی کرن اول الذکر فلم کی ہیروئن، دلیپ کمار کے چھوٹے بھائی ناصر خاں فلم کے ہیرو تھے۔ فلم باکس آفس پر بری طرح سے پٹ گئی۔

ہمارے زیر موضوع میوزک ڈائریکٹر نے اس فلم کے لیے 13 نغمات کی طرزیں بنائیں جن میں سے تین نغمات بوجوہ فلم میں شامل نہیں کیے گئے تھے بقیہ دس نغمات فلم میں شامل تھے۔ تنویر نقوی اور قتیل شفائی کے علاوہ بھی چند شعرا نے یہ نغمات لکھے تھے مگر ان کے ناموں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

بدقسمتی سے فلم کے گراموفون ریکارڈ بھی تیار نہیں ہوئے جن کی وجہ سے شائقین موسیقی کا ایک اژدھام ایک انبوہ کثیر ان نغمات کو سننے سے محروم رہا۔ یہ نغمات منور سلطانہ۔ علی بخش ظہور اور خود فلم کی ہیروئن آشا پوسلے نے گائے۔

Scanned with CamScanner

اس فلم کی ناکامی کے چند ماہ بعد دیوان پکچرز کے زیر اہتمام دیوان سرداری لعل نے فلم "غلط فہمی" عرف میں 1949ء بنائی۔
اس کے ہدایت کار احمد اللہ اجمیری تھے، نغمات طیفل ہوشیار پوری۔ عرش لکھنوی اور آئی۔ اے ناز ش تھے اس فلم کی موسیقی بھی عنایت علی
ناتھ نے بنائی اس فلم کے لیے انہوں نے دس نغمات کی طرزیں بنائیں بدقسمتی سے یہ فلم بھی ناکام رہی مگر اس کے تین نغمات نے سامعین کو
ضرور اپنی طرف متوجہ کیا دو نغمات نے اچھی طرز وہ اور اچھی گائیکی کے سب جبکہ تیسرے نغمے نے ایک چربہ پن کے حوالے سے۔ پہلے دو
نغمات اقبال بیگم لائل پور والی (بالی لائل پوری) نے گائے ایک نغمے کے بول ہے۔

اور دوسرا یہ تھا

مورے سیاں کی بالی عمریا میں تو چودہ برس کی چھوڑی رے

اے چاند اُن سے کہنا

تیسرا نغمہ اقبال بانو کی آواز میں تھا جب اُن دنوں کے نہایت مقبول انڈین نغمے کی کاپی تھی نوشاد علی نے یہ نغمہ فلم درد کے لیے
موزوں کیا تھا اور اسے اومادیوی نے (بعد میں المعروف ٹن ٹن) بہت خوبصورت گایا تھا اور یہ Speer song کی حد تک مقبول ہوا تھا۔

افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا

بعینہٖ اسی طرز میں فلم غلط فہمی کا نغمہ اقبال بانو کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا

افسانہ لکھ رہیں ہوں میری جان پیار کا

نغمے کی پیچوئش بالیقین مزاحیہ ہے اور اشعار بھی مگر گائیکی بہت سنجیدہ ہے یہ ایک تضاد ہے جو اس نغمے کا طرہ ہے۔
فلم "غلط فہمی" کے تمام ریکارڈ بنے اور ریلز ڈ بھی ہونے یہ آج بھی کی گراموفون ریکارڈ کلکٹرز کی الماریوں میں پڑے ڈبوں کی
زنیت ہوں گئے۔

ماسٹر ناتھ نے کل دو فلموں کے لیے تخمیناً بائیس نغمات کی موسیقی بنانا غالباً دونوں فلموں کی اوپر ہے ناکامی کے بعد غالباً انہیں اور
کسی فلم کی موسیقی کا Conpatc نہیں مل سکا ہوگا یا شاید اور کچھ وجوہات ہوں یا پھر یہ کہہ لیجے کہ بدنصیبی ہی نے انہیں مغلوب کیے رکھا۔
ماسٹر ناتھ کی صحت اب بہر حال رفتہ رفتہ گرنے لگی تھی۔ اُن کی بڑی بیٹی رانی کرن جلد ہی فلمی دنیا سے کنارہ کش ہوگئیں تھیں۔
پھر آنے والے سالوں میں آشا پوسلے بھی مسلسل ناکامیوں کے بعد بالآخر ویمپ کے طور پر کامیاب ہوئیں اور پھر متنوع فلموں میں بطور
ویمپ انہوں نے بڑی اعلیٰ اور خوبصورت کردار نگاری کی۔

ماسٹر عنایت علی ناتھ کی تیری بیٹی کوثر پروین جنہوں نے پلے بیک سنگر کے طور پر بڑا نام کمایا اور بڑے بڑے خوبصورت اور

Scanned with CamScanner

دلنشین نغمات یادگار چھوڑے (یہ موسیقار اختر حسین اکھیاں کی اہلیہ تھیں) عین عالم شباب میں اُڈاری مار گئیں۔ تین بہنوں کے اکلوتے بھائی شمشیر علی نے ریڈیو پاکستان لاہور سی پی یو میں ایک طویل عرصہ ملازمت کی اور چند سال پیشتر وہ بھی ملک عدم سدھارے۔

اللہ باقی اور سب کچھ فانی

باوجود کوشش بسیار کے ماسٹر عنایت علی ناتھ کے سن وفات کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ ماسٹر ناتھ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے قلعہ گوجر سنگھ والے مکان میں مختلف سازوں کا ایک بڑا ہی قابل دید اور خوبصورت میوزیم بنایا ہوا تھا۔

پیانو اُن کا بڑا مرغوب ساز تھا۔ بڑے بڑے نایاب پیانو اس میوزیم کی زینت تھے۔ کئی شوقین اور موسیقی اور بالخصوص سازوں کے رسیا اس میوزیم کو دیکھنے آتے رہے تھے۔

تین بیٹیاں تینوں ہی فنکار ہوئیں ایک بیٹا وہ بھی اعلیٰ اور عمدہ وائلسٹ۔ خود گھرانے کا سربراہ فرایر رنگارنگ کا ہمراز و ہمدم۔ دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ اُس میوزیم اور اہل خانہ کی وجہ سے فضا نہایت سریلی تھی۔

پیانو کے علاوہ سرود، طبلہ، ڈھولک، سنتور، بینجو، رباب، گٹار، لویا Spinged اور Sponked ہر دو ساز عجب بہار دکھاتے تھے اور یہاں بھی وفاداری بشرط استواری پھونکا ساز Blowing Inspunor کا نام ونشان نہیں تھا۔ کیسی انوکھی ادا ہے اور کیسی منفرد لگن، ع وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

اُن کی وفات کے چند سال بعد تک یہ میوزیم اپنی چمک دمک اور چھب ڈھب کے ساتھ جگمگا تا رہا مگر رفتہ رفتہ یہ جگمگاہٹ ماند پڑنے لگی اور سازوں کو مزید خرابی سے بچانے کے لئے اُن کی اولاد نے متفقہ فیصلے سے یہ سارے ساز مختلف فلم ساز اداروں اور سٹوڈیوز کو Donate کر دیئے۔ آج بھی اُن میں سے کئی ساز شاید مختلف سٹوڈیوز میں موجود ہوں گے۔

اُن کا سن وفات ایک محتاط تخمینے کے مطابق 1958ء ہے اس اعتبار سے اُن کی عمر تقریباً پچپن برس بنی ہے۔ ان کے بیٹے شمشیر علی نے مجھے ایک نایاب تصویر عنایت کی تھی جو ان کے والد بزرگوار کی قبر کی ہے جسے اُن کی والدہ (بیگم ناتھ) نے بڑے اہتمام کے ساتھ ایک خطیر رقم لگا کر سنگ مرمر سے بنوایا تھا۔ بی بی پاکدامناں (المعروف بیسیاں صاحب) کا قبرستان ہے۔ تصویر کی خاص الخاص اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اپنے والد کی قبر کے پاس اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی کوثر پروین کھڑی ہیں۔ عہد مہتاب اور نوعمری کے وسط کی غمازی کر رہی ہیں۔ پس منظر میں اس کا کتبہ، تاریخ وفات نہیں پڑھی جا سکتی۔ مگر یہ جلی حروف میں شفاف اور روشن سا پڑھا جا سکتا ہے۔

ماسٹر عنایت علی نیچے یہ شعر مرقوم ہے۔

جب بشر موت کے پنجے میں گرفتار ہوا نہ کچھ عذر نہ کوئی انکار ہوا

Scanned with CamScanner

صاحبو!

سچ ہے کہ کھا گئی کیسے کیسے لوگ
شہر خموشاں خاک تری

فلم.....تیری یاد.....1948ء
ہدایت کار:۔داؤد چاند
فلم ساز:۔.....دیوان سرداری لال
خادم محی الدین (بی۔اے)
کہانی نگار و مکالمہ و سکرین پلے:۔
موسیقار: ماسٹر ناتھ (عنایت علی)
نغمہ نگاران: تنویر نقوی، قتیل شفائی، چند دیگر شعراء
آوازیں: منور سلطانہ، علی بخش ظہور، آشا پوسلے
کل نغمات:۔13 عدد فلم میں دس عدد گیت شامل تھے بقیہ تین شامل نہیں کیے گئے تھے۔
تفصیل درج ذیل ہے۔

1۔ہمیں چھوڑ کے نہ جانا	منور سلطانہ
2۔او دنیا کے رکھوالے او بھاگ جگانے والے	منور سلطانہ
3۔میں تتلی بن کر آئی جوبن نے لی انگرائی نیند نہ آئی	آشا پوسلے
4۔چھلکی جوانی ہائے جیا مورے ڈولے	آشا پوسلے
5۔بیتی بہار چھائی خزاں سارا چمن رو رہا ہے	آشا پوسلے
6۔محبت کا مارا چلا جا رہا ہے نہ راہوں کو جانے نہ منزل کو جانے	علی بخش ظہور
7۔سپنے ٹوٹ گئے من میں پیار بسانے والے ہم سے روٹھ گئے	علی بخش ظہور
8۔بول بول ری دو پہر میں کہاں گئی تھی دوگانا	علی بخش ظہور
9۔او تیری یاد آئے تیری یاد آئے بیتی باتوں کے افسانے دہرائے	منور سلطانہ
10۔کہا آئی ہے آج یاد سہانی من کرے من مانی	آشا پوسلے

☆درج ذیل تین گیت بوجوہ فلم میں شامل نہیں کیے گئے تھے۔

11۔کوئی من میں میرے چھائے کہ درد بھی من میں آئے دوگانا	منور سلطانہ
12۔برباد ہے کیوں میری اُمیدوں کا گلستان	علی بخش ظہور

Scanned with CamScanner

13۔میرا دل دھڑک رہا ہے تیری یاد کے سہارے اک سوگ ہے فضا میں منور سلطانہ

فلم.....غلط فہمی.....1949ء

فلم ساز:۔دیوان سرداری لعل ہدایت کار احمد اللہ احمیری

کہانی نگار: خادم محی الدین (بی اے)

اداکارہ: آشا پوسلے، نذر، جہانگیر، رانی کرن، بیگم پروین، ارشاد بیگم، بیگم رضا، غلام قادر، زرینہ

نغمہ نگاران: طفیل ہوشیار پوری، عرش لکھنوی۔آئی۔اے ناز ش موسیقار: ماسٹر ناتھ

آوازیں: منور سلطانہ، نذر حسین، آشا پوسلے، اقبال بانو

تفصیل نغمات:

1۔کوئی مجنوں سے کہہ دو تیرا جوڑ دی دار بیٹھا ہے نذر حسین

2۔او چھیلا مورے تیری گلی کے چھورے منور سلطانہ

3۔اک ٹاک کروں سو ٹاک کروں دوگانا آوازیں نامعلوم

4۔او مورا نتھا جوبن چھپا کے رکھ دے آشا پوسلے

5۔روپ کی بدری چھائی آشا پوسلے، نذر حسن

6۔ہائے نی باگڑ بلو ہائے ہائے باگڑ بلے نذر حسین، آشا پوسلے

7۔ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے آشا پوسلے

8۔چھپ چھپ لالہ جی نے کیتی اے بلیک آواز نامعلوم

9۔افسانہ لکھ رہی ہوں مری جان میں پیار کا اقبال بانو

10۔مورے سیاں کی بالی عمریا اقبال بیگم لائل پوروالی

11۔اے چاند اُن سے کہنا اقبال بیگم لائل پوروالی

12۔تیری الفت میں ہم نے خدا کی قسم نذر حسین

Scanned with CamScanner

آپ کا خط ملا.....

ایز دعزیز، ساہیوال
ماہنامہ ''نمود'' کی اشاعت پر مبارک باد ہو، اس میں حمد اور نعت کے ساتھ ''سلام'' کو شامل کر کے بہت اچھا کیا ہے۔ تصاویر بلیک اینڈ وائٹ میں شائع کریں۔ اللہ کامیاب کرے، آمین

صفدر سلیم سیال، جھنگ
تازہ غزل پیش خدمت ہے۔ اس دعا کی ساتھ کہ آپ کا رسالہ قبولِ عام بلکہ خاص وعام حاصل کرے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے وسیع علمی وادبی تجربے کے باعث یہ رسالہ شعروادب کی تاریخ میں منفرد وممتاز مقام حاصل کرے گا۔

تنویر قاضی، گوجرانوالہ
''نمود'' کی ضرورت تھی، آمد خوشگوار لگی۔

زاہد مسعود، لاہور
''نمود'' دیکھا اور پڑھا۔ ماہ نو سے ریٹائرمنٹ کی افادیت کو محسوس کیا۔ کام مشکل ہے مگر تم کرتے رہنا۔ آخر لوگ تمناء بے تاب کے بغیر بھی تو صبر طلب عاشقی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میری نیک تمنائیں ہمیشہ کی طرح تمہارے ساتھ ہیں۔

مظہر سلیم مجوکہ
محترم شاہ جی! سلامت رہیں۔ عنقا اپنی راکھ سے دوبارہ جی اٹھتا ہے "نمود" نظر نواز ہوا تو اس بات کا یقین ہو گیا۔ "نمود" کے اجراء پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ پہلے شمارے نے ہی دل موہ لیا۔ "ماہِ نو" سے جانے کے بعد آپ اپنے حلقہ قارئین کے دلوں میں رہے اور آپ نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا۔ "نمود" کا اجراء آپ کی طرف سے قارئین سے رابطے بحال کرنے کا عملی ثبوت ہے۔ مختصر سا اداریہ بہت اچھا لگا۔ واقعی اسے ایک معیاری، علمی وادبی جریدہ بنانے میں سب کو تعاون کرنا ہوگا۔ زیرِ نظر شمارہ ہر لحاظ سے مکمل لگا۔ حمد، نعت اور سلام میں عمدہ انتخاب کیا گیا ہے۔ نعت میں محمد ظفر الحق چشتی کے شعر:

بغیر اس کے زمانے میں اجالا ہی نہیں کوئی　　محمد ﷺ کے سوا میرا حوالہ ہی نہیں کوئی

اور سلام میں آپ کے اس شعر نے از حد لطف دیا:

بڑے شرف بڑی عزت کا خانوادہ ہے　　وہی ہے دین جو آلِ نبی ﷺ کا جادہ ہے

مضامین میں مولانا محمد حسین آزاد کے حوالے سے اہم معلومات ملیں۔ نظموں اور غزلوں کا انتخاب بھی بہت عمدہ ہے۔ افسانے بھی انتہائی عمدہ ہیں۔ آپ کے انشائیہ نمکدان نے بھی لطف دیا۔ اور فنونِ لطیفہ میں پروفیسر سلیم الرحمن نے مینا لودھی: "ایک خوبرو جواں مرگ" مغنیہ کے حوالے سے کمال کا مضمون باندھا ہے۔ "بیٹھی نت ڈیہنہ سُنہڑے گھلاں" اور "اج کل پئی اکھ پھڑکاندی اے" سے آج کی نسل کہاں آشنا ہوگی۔ اگر پروفیسر صاحب ملکہ کافی زاہدہ پروین کے بارے میں لکھ دیں تو عنایت ہوگی۔ آپ بھی اپنی یاداشتوں کا سلسلہ شروع کریں۔ اور پرانی تصاویر کے خزانے میں سے بھی گاہے گاہے شائع کرتے رہیں۔ اندرون پہلے صفحہ پر:۔ "معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود" کا اضافہ کریں کیونکہ یہی تو آپ کا ماٹو ہے۔

سلامت رہیں۔

Scanned with CamScanner

(تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

تبصرے

نام کتاب ◄ ورثہ دانش یونان　　مصنف ◄ ظفر سپل

قیمت ◄ -/300 روپے　　ناشر ◄ بک ہوم، لاہور

''ورثہ دانش یونان'' معروف ادیب ظفر سپل کی تصنیف ہے۔ مصنف علمی ادبی حلقوں میں اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ مصنف کے اردو ادب اور فلسفے پر پاکستان کے مشہور جرائد میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی کتاب ''مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقا'' قارئین میں شہرت دوام حاصل کر چکی ہے۔

زیر نظر کتاب ''ورثہ دانش یونان'' جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ فلسفہ یونان کی تاریخ کا پس منظر بیان کیا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ تاریخ فلسفہ کا آغاز کیسے ہوا، فیثا غورث، فلسفیوں کا ٹولہ، سوفسطائیت۔ ابتدائی فلسفے پر بُرا وقت، فلسفے کا عروج، سقراط: فلسفے کا موت سے مکالمہ، افلاطون، ارسطو کا فلسفہ اور فلسفہ زوال، فلسفہ مابعد ارسطو، رواقیت، اپی کیوریت، تشکیک، نوفلاطنیت کا خصوصی ذکر کیا ہے۔

مصنف ظفر سپل اپنی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ''فلسفے کا آغاز اسی دن ہو گیا تھا، جب ذہن انسانی بلوغت کی اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ اس نے اردگرد پھیلے کائنات کے مظاہر کو عالم تحیر میں دیکھ کر اس طرح کے سوال کرنا شروع کر دیئے تھے کہ یہ کائنات کیا ہے، اس کو کسی ذی شعور ہستی نے پیدا کیا ہے یا یہ خود بخود وجود میں آ گئی ہے۔ اس کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں۔ یہ سلسلہ موت و حیات کیا ہے اور کیا موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے، یا موت کے ساتھ ہی روح کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تاریخ انسانی کے سفر میں ان سوالوں کا جواب مانگتے اور سوچتے ہوئے انسانی ذہن ایک لمبے عرصے تک جہالت، توہمات اور خرافات کا شکار رہا، حتیٰ کہ اس نے یونان کی سرزمین پر قدم رکھ دیا۔ یہ سوچ کے سفر کا پہلا بابرکت پڑاو ہے، جہاں انسانی ذہن نے بتدریج فکری مسائل کی سادہ ترین توجیہات سے لے کر خالص منطقی اور سائنسی نظریات پیش کیے۔ یہ کہنا تو مبالغہ آمیز ہوگا کہ فلسفے کا آغاز یونانیوں سے ہوا۔ یونانیوں سے قبل مصریوں اور بابل اور نینوا والوں کی صورت میں ایسی علم دوست قوموں کا پتہ ملتا ہے، جنہوں نے فکری خزانے میں قابل قدر اضافے کیے اور ایران، چین اور ہندوستان کی صورت میں کم از کم تین ایسے مراکز ضرور موجود تھے، جہاں فکر و فلسفہ

کی توانا روایات نے جنم لیا۔ مگر یہ یونان ہی تھا، جہاں فلسفے کو ایک جامع اور مستند علم کے طور پر پروان چڑھایا گیا۔ لفظ ''فلسفہ'' (philosophy) یونانی زبان ہی کے دو الفاظ ''فلوس'' (philos) اور ''سوفوس'' (Sophos) سے مل کر بنا ہے۔ فلوس کا مطلب ہے ''دوست'' اور سوفوس کے معنی ہیں ''دانش''۔ اسی لیے ''فلسفی'' کو آج بھی ''علم دوست'' کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ مگر یہ کہنا ہرگز مبالغہ آمیز نہیں ہے کہ تاریخ فلسفہ میں آنے والے اگلے دو پڑاو کے مقامات..... مسلم فلسفہ اور جدید مغربی فلسفہ..... کے مفکرین نے جو عظیم نظام ہائے فکر پیش کیے، وہ نہ تو اس وقت تک تشکیل پا سکتے تھے اور نہ آج اپنی پوری گہرائی کے ساتھ سمجھے جا سکتے ہیں، جب تک کہ فلسفہ یونان کو اپنی مبادیات کے ساتھ سمجھ نہ لیا جائے۔

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کیا ہے۔ ایم سرور نے معیاری پروڈکشن، دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔

☆☆☆☆

نام کتاب ◄ نیا سویرا (ناول) مصنف ◄ صادق حسین

قیمت ◄ -/600 روپے ناشر ◄ بک ہوم، لاہور

''نیا سویرا'' معروف ادیب صادق حسین کا ناول ہے۔ اس سے پہلے مصنف کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں: ''پھولوں کے محل''، ''شہر اندر شہر''، ''گلاب کے آنسو''۔ اور افسانوں کی کلیات ''افسانے صادق حسین'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ قارئین کی طرف سے بھرپور پذیرائی ملی ہے۔ مصنف کو کئی قومی اداروں کی طرف سے ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مصنف کی افسانہ نگاری پر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی جانب سے ایم اے اردو کا مقالہ شائع ہوا۔ اس کے علاوہ برصغیر کے ممتاز ادیبوں کی طرف سے ان کی ادبی خدمات کو سراہا گیا۔

افسانہ ''پونچیاں'' اور ''خون کا معبد'' ۱۹۷۳ء میں پنجاب بورڈ کے میٹرک کے کورس میں شامل کیے گئے۔ ''مولا پہلوان''، ''خون اور پانی''، ''جوتے'' اور ''خوشبو'' پاکستان ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ کیے گئے۔ افسانہ ''پونچیاں'' کا انگریزی ترجمہ ۱۹۸۱ء میں آر سی ڈی کلچرل انسٹیٹیوٹ کی مطبوعہ کتاب "Modern Urdu Short Stories" میں شائع ہوا۔ یہی افسانہ اکادمی ادبیات پاکستان کی مطبوعہ کتاب "Pakistani Litrature" میں ۱۹۹۳ء میں بھی شائع ہوا۔

''نیا سویرا'' (ناول) صادق حسین کا ایک بھرپور ناول ہے اس میں پاکستان کے طبقاتی سماج کی عکاسی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح جاگیردار، نواب، وڈیرے عوام کا استحصال کرتے ہیں اور خصوصی طور پر عورت سے ظلم و ستم روا رکھتے ہیں اور معاشرے میں

Scanned with CamScanner

جرائم کے مرتکب بھی یہی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ خود جرائم کرتے ہیں یا پشت پناہی کرتے ہیں۔ یعنی مصنف نے اپنے ناول میں تحریر کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے یہی لوگ ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔

امید ہے کہ ان کے افسانوں کی طرح قارئین ان کے ناول کو بھی پسند کریں گے اور قارئین کی طرف سے بھرپور پذیرائی ملے گی۔

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کیا ہے۔ ایم سرور نے معیاری پروڈکشن، دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔

☆☆☆☆

نام کتاب ◄ گمانِ آگہی

شاعر ◄ ڈاکٹر افتخار بخاری

قیمت ◄ -/260 روپے

ناشر ◄ بک ہوم، لاہور

زیرِ نظر کتاب ''گمانِ آگہی'' معروف کالم نگار، شاعر ڈاکٹر افتخار بخاری کا شعری مجموعہ ہے۔ کتاب کے ابتدائیہ میں شاعر موصوف کہتے ہیں: ''شاعری خواہشات، جذبات اور حالات کا وہ مرکب ہے جسے ہم اپنے شعور، تجربات اور آگہی کی بناء پر الفاظ کے بت تراش کے پیش کرتے ہیں۔ یہ انسان کے اندر کی ایک جنگ بھی ہے جس کا خلاصہ شاعری کی شکل میں مرتب ہوتا ہے، اندر کی روشنی جب باہر کے اندھیروں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو انسان ایک ان دیکھے سماجی عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ آگہی کا عذاب ہے، آگہی ایک سمندر ہے اور غوطہ زن کو اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہو سکتا اس میں ڈوبا ہوا انسان بدقسمتی سے اپنی سطحِ آب کو ہی سمندر سمجھ لیتا ہے اور یہی گمانِ آگہی ہے جبکہ زمین کائنات کا ایک ذرہ ہے اور اس ذرے کا ذرہ انسان اپنے وجود پر اترا تا رہتا ہے جبکہ زندگی وجود نہیں آگہی ہے اور اس آگہی کے وجود میں داخل ہو جانے والے ہی زندگی کا حصہ بن سکتے ہیں ورنہ انسانی شکل میں چلتے پھرتے لاکھوں، کروڑوں وجود محض زندہ لاشیں ہیں جو اپنے وجود کی بقاء کے علاوہ باہر کی ہر شئے سے لاتعلق ہیں۔

کتاب کے پیش لفظ میں معروف صحافی منو بھائی لکھتے ہیں ''شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر افتخار بخاری اس لحاظ سے بہت حد تک ''نویں نکور'' ہیں کہ وہ ادب اور شاعری کے نقادوں اور تبصرہ نگاری کی زد میں نہیں آئے مگر افتخار بخاری کی سوچ ہر لحاظ سے شاعرانہ سنجیدگی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ انسانیت کا دکھ اور دردان کی سوچ کا محور ہے اور یہی ان کی شاعری کا اصل تعارف ہے جو ان کی شاعری کے حوالے سے شہرت اور مقبولیت کے تمام لوازمات سمیٹے ہوئے ہے۔ ادب اور شاعری کے میدان میں ''گمان آگہی'' کا تمام ادب دوستوں کی طرف سے خیر مقدم کیا جائے گا۔''

ادیب محمد اقبال اثر کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ''بخاری صاحب کی مثال اس آوارہ

Scanned with CamScanner

غزال سے تو نہیں دی جاسکتی جو اپنے ہی نافے کی خوشبو کی تلاش میں عمر بھر سرگرداں رہتا ہے کیونکہ بخاری صاحب نے تو نہ صرف اس خوشبو کو پالیا ہے بلکہ اسے کھلی ہواؤں کے سپرد بھی کر دیا۔ بس اتنا ہے کہ یہ خوشبو کہیں دھیمی کہیں تیز اور کہیں تلخ ضرور ہے مگر ناگوار ہرگز نہیں۔"

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کیا ہے۔ ایم سرور نے معیاری پروڈکشن، دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔

☆☆☆☆

نام کتاب ◄ زیر، زبر، پیش

مصنف ◄ عبدالعلی شوکت

قیمت ◄ -/300 روپے

ناشر ◄ بک ہوم، لاہور

شاعر عبدالعلی شوکت جالندھر شہر میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ فلسفے میں ایم اے کرنے کے بعد پاک فضائیہ کے شعبہ تعلیم میں جنوری 1984ء تک ملازم رہے۔ سکواڈرن لیڈر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ مدت ملازمت کا زیادہ عرصہ بطورِ "ماہرِ نفسیات" انٹر سروسز سلیکشن بورڈ کوہاٹ میں گزرا۔ کچھ عرصہ روزنامہ "آزاد" لاہور میں نیوز ایڈیٹر اور روزنامہ "الحجاز" لاہور میں چیف ایڈیٹر رہے۔ روزنامہ مساوات لاہور میں بطور جنرل منیجر خدمات انجام دیتے رہے۔ شاعر موصوف انگلش سے اردو ترجمہ کرنے میں مہارت رکھتے ہیں اور کئی شہرۂ آفاق کتابوں کی اردو تراجم کر چکے ہیں۔

ذوقِ شاعری میٹرک میں ہی شروع ہو چکا تھا جنگ عظیم دوئم کے اوائل میں تحریکِ آزادیِ ہند سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں۔ علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور الطاف مشہدی کے ترقی پسندانہ خیالات کا ان کے کلام پر کافی مثبت اثر محسوس ہوتا ہے۔ ان کی متعدد غزلوں میں جبر، گھٹن اور آمریت کے خلاف واضح اشارے ملتے ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "لرزاں ساعتیں" غزلوں کا مجموعہ ہے جبکہ دوسری تصنیف "نورِ یقین" کے نام سے ان کی نعتوں، ملی نغموں اور وطنی نظموں کا مجموعہ ہے۔

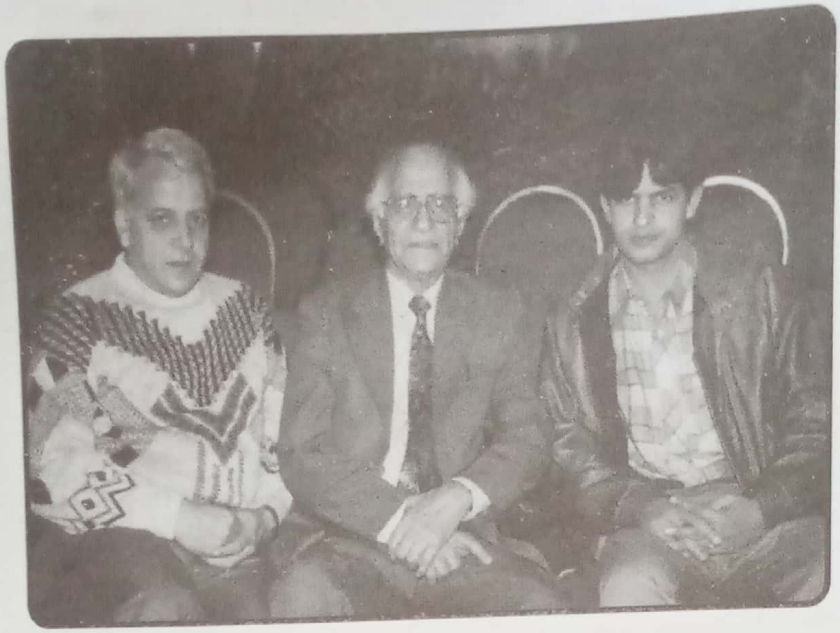
زیرِ نظر کتاب "زیر، زبر، پیش" ان کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ چونکہ میرا ذہن شروع ہی سے آمریت کے خلاف رہا ہے اور زیادہ تر شاعری مزاحمتی ادب پر مشتمل ہے جسے عمومی طور پر پسند کیا گیا۔ زیرِ نظر مجموعے میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ امید ہے کہ اسے پہلے مجموعوں کی طرح قابلِ تحسین پذیرائی حاصل ہوگی۔

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کیا ہے۔ ایم سرور نے معیاری پروڈکشن، دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

ماہنامہ نمود لاہور



افضل ساحر، احمد ندیم قاسمی، قائم نقوی



راشد مراد، طالب قریشی، امداد ہمدانی

جوگی جہلمی، تنویر سپرا



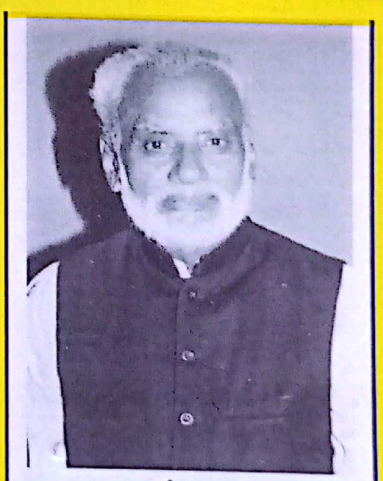
طارق بلوچ، ڈاکٹر خالد جاوید جان، ستیہ پال

محمد حنیف، تنویر ظہور، اقبال احمد خان

Scanned with CamScanner



نیشنل بک کونسل کی ایک تقریب میں سید رضی ترمذی، اشفاق احمد، سید قاسم محمود، اور تقریر کرتے ہوئے پروفیسر سجاد باقر رضوی



سید قاسم محمود

17 نومبر 1928ء ---------- 31 دسمبر 2010ء



بزم کتاب کے ایک اجلاس میں محمد طفیل (مدیر نقوش)، قدرت اللہ شہاب اور سید قاسم محمود

Scanned with CamScanner